بکھرا ہوا البم

اقبال متین

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔۳
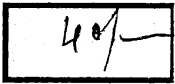
قیمت: 4/-

اِنتساب
میرے بابا مرحوم کے نام

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ ۳

کتابت:۔ وقار رضوی
مطبع:۔ نظامی پریس
بار اول: چھ سو ۶۰۰
جون ۱۹۷۲

فہرست

ایک پھول ایک تتلی

بنجر زمین پر پھوار پڑے یا موسلا دھار بارش ہو جب کونپل ہی نہیں پھوٹے گی تو پھر کلی کا چٹکنا معلوم۔ رضیہ بھی بس ایسی ہی ایک بنجر سی زمین تھیں۔

سوکھی ساکھی دھرتی کی طرح بچھا کے قدموں کے تلے بچھی رہتیں۔ کٹے ہوئے کیت کے سوکھے ٹھنٹھ بھی ہوتے تو کوئی دیکھ بھال کر قدم رکھتا کہ مبادہ اپنا پیر زخمی ہو جائے یا پھر زندگی کی رسماہٹ ہی رہے ننھے ننھے ہرے ہرے پودے زادوں کی طرح سینہ تانے کھڑے ہوں تو پھر زندگی کو کچل دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس لیے اٹھنے والے قدم خود ہی پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ لیکن رضیہ بیگم تو ں اس سوکھا ساکھا جنگل تھیں ـــــ چوب خشک صحرا تھیں۔ قافلہ آگ ہی لگاتا تھا نہ دانہ ہی ہوتا تھا۔

محرومیاں نیکی کا روپ دھار لیتی ہیں تو نیکیاں قابلِ رحم حد تک مجبوریوں کا پرتو معلوم ہوتی ہیں اور جب یہی محرومیاں گناہ بن کر چھاتی ہیں تو بیچاری نیکی کو سر چھپانے کو آسرا تک نہیں رہتا۔

رضیہ چچی کی محرومیاں بس نیکی بن کر رہ گئی تھیں۔ ایسی نیکی جو خود نیکی سے خوف کھائے اور خاندان سارا اس نیکی پہ مرمٹا تھا۔

خدمت، خدمت — خدمت — اپنے سے چھوٹوں کی خدمت کر رہی تھیں برابر والوں کی خدمت کر رہی ہیں۔ بزرگ تو بزرگ ہی ٹھہرے — نہ ستائش کی پروا نہ صلے کی طلب۔ نیکی تقسیم ہو رہی تھی۔ اب جس کے دامن میں جتنی گنجائش رہے سمیٹ لے، جس کی جھولی جتنی وسیع ہو بھرے اور چچا میاں نے سب سے زیادہ سمیٹا، سب سے زیادہ بھر لیا۔

رضیہ چچی کو چچا میاں کی جھولی بھر کر بڑی خوشی بھی تو ہوتی تھی۔ بڑا آنند بھی تو ملتا تھا — لیکن بقدر ہمت ہر ایک نے رضیہ چچی سے کچھ نہ کچھ لیا اور وہ بھی کس طرح۔ خود انھیں کچھ دینے کے بہانے۔

اور رضیہ چچی دنیا بھر کا دکھ درد سینے میں چھپائے بس نیکی بنی رہیں — اور دنیا کے ٹھاٹھیں مارتے بیکراں سمندر کی موجوں پر بس ڈولتی رہیں — غرق ہونے کا ڈر نہیں یا پار اترنے کی فکر نہیں۔

"رضو چچی، دو روز ہمارے گھر چلیے نا" بس صبح سے شام تک کچھ نہ کچھ کیے جاتی ہیں کبھی کبھی کوئی تبدیلی تو ہونی ہی چاہیے زندگی میں۔ اس طرح تو زندگی بجائے خود ایک "روزمرہ" بن جائے گی۔"

"اور پھر تمھارے بچا کو جو تکلیف ہوگی۔"

بس لاکھ سوالوں کا ایک جواب رضو پھپی کے پاس کانسے کی گولی کی طرح ڈھلا ڈھلایا تیار رہتا ـــــ وہ جس سمت میں چاہتیں کھٹ سے اس گولی کو لڑھکا دیتیں۔

"رضیہ ـــــ میری اچھی سی رضو بی بی ـــــ پانچویں کو مانجے ہیں۔ ساتویں کو مہندی، آٹھویں کو ساچق اور نویں کو جلوہ۔ دسویں کو چوتھی ہوگی ـــــ گیارھویں کو سورج کی کرنیں اپنے ہی گھر کی چہار دیواری میں اسی طرح محفوظ پاؤگی جس طرح آج چھوڑ جاؤگی ـــــ چلو بھی اب"

موماں کمیر نویں کو جلوے کی کیا سوجھی بھلا۔

اماں بی کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ جو الٹی سیدھی تاریخیں بتلا رہی ہیں ان میں جلوہ نویں کو آدھمکے گا۔ شادی تھی ابھی دور ـــــ وہ چلی تھیں رضیہ پھپی کو جُل دینے ـــــ کسی نہ کسی طرح انھیں بہر حال اپنے گھر لے آنا تھا ـــــ وہ آجاتیں تو جیسے سارے گھر کی آسائشیں آجاتیں۔ دلوں کو اطمینان اور سکون حاصل ہو جاتا ـــــ سینے خوشیوں سے منور ہو جاتے، قلب گرما جاتے۔

چہرہ دیکھو تو ازلی کی بیمار معلوم ہوں لیکن اس ڈھنگ سے اس ڈھب سے ہنسی کا نقاب سارے چہرے پر ڈال رکھتیں کہ اندر کے کرب تک کسی کی کیا مجال جو پہونچ جائے۔

تقریب میں جاتیں، دکھ بیماری میں جاتیں، جہاں اور جس وقت

جاتیں اس طرح جاتیں جیسے خوشی سب کی ہو تو سب کی نہ ہو تی بس انھیں کی ہوتی۔ غم سب کا ہو تو سب کا نہ ہوا بس انھیں کا ہوا۔

ایک دن آدھ جھگڑت ہوتی ــ پھر سب کے سب یہ بھول بھال جاتے کہ بڑے چاؤ اور لگن سے بڑی محبت اور پیار سے انھیں نے آئے تھے کہ پھر خاطر کریں، کچھ مدارات ہو۔

لیکن رضیہ پھچی نے دیر و حرم کی ساری نیکیاں پلوؤں باندھ رکھی تھیں۔ اب وہ آہستہ سے پلو کی گرہ کھولتیں اور اجالے سے بکھر جاتے۔ یہ اجالے سارے کے سارے ان کی ذات کے لیے بالکل نہیں تھے۔ وہ تو بس آنکھ بند کیے موتیوں کی طرح نیکیاں بکھیرتی تھیں ــ اجالے کر دینے والوں نے انھیں صرف اندھیرے دیے۔ لیکن انکے چہرے کی ہنسی نہ گئی سو نہ گئی۔ مضمحل سے چہرے پر دکھتی ہوئی ہڈیوں پر جھلکی ہوئی گہری اداسی نے کبھی غم کی پرچھائیں پڑنے دی، نہ محنت پر تھکن محسوس کی، نہ خاندان بھر کا بوجھ اٹھا لینے سے گریز کیا۔

صبح اٹھتیں، الٹی سیدھی بات کی گلوری منھ میں ٹھونس لیتیں۔ کمر اس طرح سیدھی کرتیں جیسے آنکھیں میچ کر طاقت کے انجکشن لگوا رہی ہوں اور کام میں جٹ جاتیں ــ پھر سارے گھر والے مہمان بن کر بیٹھ رہتے۔ رضیہ پھچی میزبان بنیں ہر ایک کا خیال رکھتی پھرتیں ــ "اجو نے کھانا نہیں کھایا۔ ارے بو کے چائے نہیں پی ــ میاں کے لیے پانی تو گرم کر دیا ہوتا بوا، وہ اب اٹھتے ہی ہوں گے۔ یہ ہانڈیاں آنگن میں اس طرح کیوں پھیلا رکھی

ہیں ــــ الگنی پر یہ ڈھیر سے کپڑے یوں نہیں رکھ چھوڑتے۔ لاؤ میں سمیٹ لوں۔"

"ماں جی سن رہی ہو؟ ــــ لیکن ماں جی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی رہتیں۔ اور رضیہ آپی خود ہی سودے سلف کا حساب جوڑنے میں ماتھا پچی کرتی رہتیں۔

بچے بارے تنگ کرتے سو الگ ــــ انہیں اٹھانا، کھانا کھلانا، پڑھانا اور یہ سب کوششیں کرتیں ــــ سب سے پہلے جاگتیں اور سب کے بعد سوتیں ــــ ساری رات جاگے بھیجنا اور رات گئے تک اندھیرے میں بیٹھنا۔

مشین بھاری مشین کا ایک پرزہ بھی ڈھیلا ہو جاتا تو ساری مشین ٹھپ ہو کر رہ جاتی لیکن رضیہ آپی ایسی مشین تھیں کہ کل پرزے جھڑتے رہتے۔ چولیں ہل کر رہ جاتیں، انجر پنجر ڈھیلا ہو جاتا۔ لیکن کسی کو کچھ خبر ہی نہ ہوتی اور کام برابر چلتا رہتا۔

بے تیل کا چراغ تھیں جیسے موم کی بالتی۔ لیکن جلتیں بڑے دھڑلے سے بڑے ٹھسے سے۔

آدمی اگر اپنے آپ کو اس طرح تج دے تو شاید دیکھنے والوں کا احساس بے طرح مٹ جاتا ہے ــــ رضیہ آپی کو سبھوں نے اپنا لیا تھا اور رضیہ آپی نے سبھوں کے کام کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کو پیارے تھے ــــ اب کون کس کو زیادہ پیارا ہوا۔ یہ آپ طے کیجئے۔

رضیہ آپی کو بنجر زمین کہنا زیادتی ہی نہیں، ان کی توہین بھی ہے۔ یہی تو

جو خاندان بھر کے لیے صرف ابرِ رحمت نہیں، بارانِ رحمت بھی ہو ــــ ایسی عورت جس کے مزاج کے ٹھنڈے سائے تلے اور مضمحل چہرے کی نرم دھوپ نے خاندان بھر کی کھیتی ہری کر دی اس کی کوکھ سے نمی نہ پھیلے تو کیا، کونپل نہ پھوٹے تو کیا۔

لیکن یہ دکھ درد خاندان بھر کا تو نہ تھا ــــ رضیہ بچی کا اپنا دکھ تھا۔ رضیہ بچی کا اپنا درد ــــ رضیہ بچی کی اپنی خوشی کبھی کسی نے دیکھی نہیں۔ رضیہ بچی کا اپنا دکھ درد کسی نے بانٹ نہیں لیا۔

اسی لیے تو انھیں بنجر زمین کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ــــ دو دو حمل ٹھہرے دونوں ہی ساقط ہو گئے ــــ رضیہ بچی پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بلک بلک کر تڑپیں لیکن مولا کی مرضی میں کون دخیل ہو سکتا ہے بھلا۔

"پتہ نہیں میں کون گناہوں کا خمیازہ بھگت رہی ہوں"

کبھی رضیہ بچی نے ایسی بات کی بھی تو کچھ اس انداز سے کی جیسے اپنے گناہ انھیں معلوم ہیں ــــ اور پھر انھوں نے کبھی ایسی بات کی ہی نہیں۔

کونپلیں ایک نہیں دو بار پھوٹی تھیں۔ ننھے ننھے پردوں کا روپ ڈھلنے سے پہلے سب کچھ خشک ہو گیا۔ اور اس طرح ہوا کہ ساری دھرتی بنجر ہو کر رہ گئی۔

اب ان کی زندگی میں کوئی اجالے کی کرن تھی تو بس یہی کہ وہ خاندان بھر کی پیاری تھیں۔ چاہے جانے اور پسند کیے جانے کی خواہش آدمی کی فطرت ہے۔ پھر ایسے میں جب کہ اپنا کچھ بھی نہ رہے تو یہی دوسروں کی دی ہوئی محبتیں

زندگی کے دکھ درد کو مسکرا کر سہن کرنے میں بڑی مدد کرتی ہیں اور اس طرح رضیہ پھپھی کی محرومیاں نیکی بن بیٹھی تھیں۔

پچا میاں تو ان کے رکھوالے تھے ہی۔ اس سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا تھا۔ لیکن رضیہ پھپھی نے پچا میاں کو نہ صرف اپنی محبت دی۔ اپنا ایمان دیا، اپنی زندگی دی۔ معاوضے میں ان کی محبت تک نہیں مانگی۔ کچھ مانگا بھی تو وہ صرف پچا میاں کی خوشنودی تھی۔ اور بس۔

پچا میاں خوش ہو جاتے تو رضیہ پھپھی کے حصے میں جیسے سارے جہان کی نعمتیں سمٹ آتیں ___ وہ کسی معمولی سی بات پر بھی برا مان جاتے تو جیتی جاگتی زندگی ہی میں جیسے انکی سانسیں ان سے الگ ہو جاتیں۔

اور پھر بڑی پھپھی کی ہٹ دھرمیوں کو رضیہ پھپھی نے ہمیشہ یہ جان کر سہہ لیا جیسے ہر حق بڑی پھپھی ہی کا حق ہو ___ ان کا اپنا تو جیسے کچھ تھا ہی نہیں اور اگر کچھ تھا بھی تو اس طرح کہ پچا میاں کی خوشی ان کا سب کچھ، بڑی پھپھی کی خوشی ان کا سب کچھ، یہاں تک کہ بڑی پھپھی کے بطن سے پچا میاں کی جو اولاد تھی ان کی خوشی بھی ان کا سب کچھ تھی۔

بس رضیہ پھپھی کو یوں سمجھیے جیسے نیم کا بہت بڑا اور گھنا پیڑ ہوں۔
ننھی منی فاختائیں اس پیڑ کی شاخ پر آ بیٹھتیں تب بھی یہ پیڑ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔
موٹے تازے گدھ اس پیڑ کی شاخ پر آ بیٹھیں تب بھی یہ پیڑ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔

نہ آنکھوں کی توصیف، نہ بروں کی تحقیص۔

اب جب کسی کا سب ہی کچھ دوسروں کی خوشی ہو تو وہ خود سے رہ ہی کہاں جاتا ہے۔ اس لئے سچ پوچھئے تو اب رضیہ پھپی خود سے کچھ تھیں بھی نہیں۔

ایک دن بڑی چچی کسی بات پر برہم تھیں۔ چچا میاں کے تیور بھی کچھ ٹھیک دکھائی نہ دیتے تھے۔ ٹھنڈی جنگ یکایک بموں کے دھماکوں میں بدل گئی تو رضیہ پھپی امن کا پیام لے کر دونوں کے درمیان کود پڑیں۔

یہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری وقت تھا جو بڑی چچی اور چچا میاں کے پھیلائے ہوئے اندھیرے کو چھوٹا سا دیا لیے دور کرنے چلی تھیں۔

بڑی چچی کے پیچھے ایک دنیا تھی۔ بال بچے، ایمان، قانون سب ہی کچھ مصالحت کرانے والا یہ تو نہیں دیکھتا کہ لڑتے ہوئے ہاتھیوں کی قوت کس میں کتنی ہے۔ وہ تو صرف اس سچائی کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے جس کا نام محبت ہے، جس کا نام اجالا ہے، جس کا نام نیکی ہے۔

اور اگر کوئی اس محبت ہی کے منھ پر تھوک دے تو ــــــ

اور اگر کوئی اس اجالے ہی کے منھ پر تھوک دے تو ــــــ

اور اگر کوئی اس نیکی ہی کے منھ پر تھوک دے تو ــــــ

اور بڑی چچی نے یہی کیا ــــ کہنے لگیں ــــ اپنے کو سمجھا کیا ہے بی بی بقدر نان نکاح۔ دعوے برابری کے ہیں ــــ دو ہاتھی ٹکرائیں تو درمیان میں آنے والی چیونٹی، نہ دنیا کی رہے گی نہ دین کی ــــ رضیہ پھپی نے ادھم

اُدھر آنکھیں گھما کر خاندان بھر کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ـــ
مجھے بلندیوں تک لے چلو، مجھے اوپر اٹھا لو ـــ دنیا تو میں نے اپنی محبت
سے جیت لی ہے ـــ میرا دین کہیں سے ڈھونڈ لاؤ ـــ میں نے اپنے
بچوں کو اس دنیا میں آنے سے قبل ہی اس لیے ختم کر دیا کہ انھیں بھی ان کا دین
نہیں ملے گا۔ ان کا خدا نہیں ملے گا۔

اب رضیہ بھابی کو کون سمجھائے کہ جس سے ساری خدائی محبت کرے
وہ اس سے بہت بڑا ہوتا ہے جس سے صرف خدا محبت کرتا ہے۔

اور رضیہ بھابی ایسی کوئی بات سمجھیں گی بھی تو نہیں اس لیے کہ وہ تو بھیگی
ہوئی سی ایک نیکی بن کر رہ گئی ہیں ـــ ایک ایسا روپ بن کر رہ گئی ہیں
جو اپنا حق بھیک کی طرح مانگتا ہے۔

ایک پھول ـــ ایک تتلی
چھو لو تو اپنی خوشبو دے۔
چھو لو تو اپنا رنگ روپ تج دے۔
نہ کانٹا بن کر چبھنا آئے۔ نہ ڈنک بن کر نشتر لگانا۔

پچھلا دروازہ

"نینسی، نینسی"

لیکن وہ جانی کے ساتھ جا چکی تھی۔

میں نے اس کو تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے تیسری بار جب اس کو ٹیگ (TAG) کیا تھا تو صرف اس سے وعدہ لینے کے لیے کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ ویسے میں اس کو کئی بار ٹیگ کر سکتا تھا۔ آرکسٹرا نے ابھی ابھی اپنی دھن تبدیل کی تھی اور میرے لیے پھر موقع تھا۔ اس کے جا کلیٹوں کی تعداد دیکھتے دیکھتے بڑھ رہی تھی اور یہ اس کی مقبولیت کی دلیل تھی لیکن تیسری بار جب میں نے ٹیگ کیا تھا تو جانی نے بڑی خشونت سے مجھے دیکھا تھا شاید اس لیے کہ وہ تیسرا اسٹیپ لے رہا تھا کہ میں نے آرکسٹرا کی پروا کیے بغیر پھر ٹیگ

کر دیا۔ یہ بات ایک حد تک غیر اخلاقی ہے۔

اسی وقت میں نے نینسی سے وعدہ لیا کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ وہ ابھی پوری طرح وعدہ بھی نہ کر سکی تھی کہ کسی نے مجھے ٹیگ کیا اور میں با دل ناخواستہ ہٹ آیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جاکی نہ تھا۔

آرکسٹرا اپنے پورے شباب پر تھا، اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رقص کی رفتار آرکسٹرا سے بھی تیز ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ جو رقص کر رہے تھے انھیں زندگی اپنا حسن، اپنی خوبصورتی، اپنا رس، اپنی حرارت سب کچھ تقسیم کر رہی تھی۔ آرکسٹرا بجانے والوں کے حصے میں جیسے اس حسن، اس خوبصورتی، اس رس اور اس حرارت سے کچھ بھی نہ آیا تھا۔ وہ صرف اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے میں آفس میں فائیلس ڈیل کرتا ہوں۔

زندگی کا یہ تضاد دیدنی تھا۔

جاکی سفید اسکرٹ پہنی ہوئی ایک حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ جو نینسی سے کم خوبصورت نہیں تھی۔

جس تان سُر اور لے پر ہم تھرک رہے تھے، لپٹ رہے تھے، جھوم رہے تھے ــــ

جن لہروں پر ہم رقصاں تھے ــــ

ان لہروں کے سوتے کسی ایسی کیفیت سے پھوٹ رہے تھے جسے دکھ کہا جا سکتا ہے۔ جسے اداسی کہا جا سکتا ہے۔ جسے محرومی کہا جا سکتا ہے

لیکن رقص زندگی سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس میں اور زندگی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

زندگی کا یہ تضاد میں پھر کہوں گا کاش آپ دیکھ پاتے۔

اور اب جب کہ میں ننھی ننھی پکار رہا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اظہار ہو چکا تھا — وہی رقص جس میں ننھی نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن وہ مجھ سے ملی نہیں۔

وہ بد سیز سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ ویسے وہ چاہتے تو دنیا جہان کو روند کر رکھ دیتے — اس لیے کہ ان کے سینے میں جو دل دھڑک رہے تھے ان کی آواز مجھے معلوم تھا ایک ہو گئی تھی — بالکل ایک — لیکن اس وقت کہیں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اب جو رقص شروع ہونے والا تھا وہ بطور خاص نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے تھا۔ رات کے بارہ بجکر ایک سکنڈ پر ہم نئے سال کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ناچنے والے تھے — جانے والے سال کو وداعی بوسہ دینے والے تھے لیکن جانے والا سال جیسے اس گہما گہمی سے اس رقص سے آنکھیں چرا کر اور دامن بچا کر گزر جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک اتر گئی تھی — اس کے چہرے کا غازہ سفید سفید دھبے بن کر ابھر آیا تھا۔ اس کے اعضا کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کی پکار چپ ہو گئی تھی اور اب اس کا دل ٹھہر جانے والا تھا۔

یہ حساب تو بعد میں ہوتا رہے گا کہ ہم نے اس سال سے کیا لیا، اور

اس سال کو کیا دیا۔ کتنے تو ایسے ہوں گے جو یہ سوچتے بھی نہ ہوں گے کہ ہمیں اس طرح بھی حساب کتاب کرنا چاہیئے۔ اور کیوں سوچیں۔ زندگی بہرحال گزراں ہے، رقصاں ہے۔

مجھے پھر وزرد ہسکی میں اپنا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تل بھی نظر آ رہا تھا جو میرے بائیں گال کے اوپری حصے پر تھا اور جو شینی کو بہت پسند تھا اور جس کو اس نے کئی بار چوما تھا۔

میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں ـــــ

شاید یہ سب وہسکی کا کرشمہ تھا ـــــ

ڈانس شروع ہوتے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

مجھے شدید تنہائی کا احساس ہو رہا تھا ـــــ حالانکہ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ میں جتنی چاہئے پی سکتا تھا۔ جس عورت سے چاہے شریفانہ بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کو پینے کی آفر کر سکتا تھا۔ پھر کتنی ہی ایسی تھیں جن کے ہونٹوں کی سرخی، میں وہسکی کے صرف ایک گھونٹ کے بدلے میں چرا لے سکتا تھا۔ لیکن یہ تنہائیاں مجھ پر کیوں مسلط ہو رہی تھیں؟

وہ کون سی شے تھی جو چپکے چپکے سے آگے بڑھ کر میرے دل کے بازار میں سجے ہوئے سامان کا سودا کر رہی تھی۔ اور سب کچھ اس بے دردی سے اٹھا رہی تھی جیسے یہ بازار اب بھائیں بھائیں کرنے لگے گا۔

مجھے شینی نے اداس کر دیا تھا۔ میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کب تک کرتا۔

وہ شے نینسی ہی تھی جو میرے دل کے بازار میں سجے ہوئے سامان کا سودا کر رہی تھی۔ مجھے اداس ہونا نہیں چاہیے تھا۔ ویسے میں نینسی کے ساتھ بھی تو نہیں آیا تھا۔ اس کی ماں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ نیو ایئر بمبئی میں منا رہی ہے۔

میں نے جھٹ سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ تھام لیا جو میرے برابر سے گزر رہی تھی جس کو میں جاکی کے ساتھ ناچتا ہوا دیکھ چکا تھا اور جو نینسی سے کم خوبصورت نہیں تھی۔

اس کے پیچھے سفید سوٹ پر کالی بو لگایا ہوا ایک نوجوان بھی تھا جو شاید اس سے پینگ بڑھانے کی فکر میں تھا۔

"اوہ۔۔۔ اس نے "او" اس انداز سے کہا جیسے میرے ہاتھ تھام لینے پر خوشی سے چیخ اٹھی ہو۔

میں نے بڑی بے تکلفی سے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نے بھی اپنی کرسی قریب کر لی۔

پہلے یہ بتاؤ کیا پیو گی؟

نوجوان مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی ایسی سگریٹ کا دھواں ہوں جو مسلسل اس کی آنکھوں میں گھس رہا ہے۔

"تم کیا پی رہے ہو" اس نے پوچھا۔

"سیرشنڈ وہسکی"

"تو پھر کیر وزجن پیوں گی"

میں نے بیرا کو آواز دی

مجھے نینسی کا خیال آیا۔

میں نے بہت احتیاط سے سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی سے چوم لیا ــــ

مجھے نینسی کا پھر خیال آیا۔ جیسے وہ میرے تِل کو چوم رہی ہو ــــ

میں نے اپنے گلاس کو ایک ہی گلپ میں خالی کر دیا ــــ

میں نے پھر بیرے کو آواز دی ــــ

جب وہ سب کچھ رکھ گیا تو ہم نے جام ٹکرائے اور سپ کیا پھر میں نے کانٹے سے اٹھا کر مچھلی کا قتلہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھی کو کھلایا۔

ہاں میں یہ کہنا ہی بھول گیا کہ جب جام ٹکرائے گئے تو ہم نے (HAPPY NEW YEAR) کے نام منسوب کیا۔ جیسے ہم دونوں پریسز ڈانس روم کے ساتھی نہ ہوں بلکہ کلاس فیلوز ہوں جو ایک ہی سبق رٹ کر آئے ہوں۔ ورنہ ہر نیا سال اپنے جلو میں صرف خوشیاں ہی لے کر تو نہیں آتا ہے ــــ میں نے سوچا ہم نئے سال کے نئے غموں کے نام بھی تو جام تجویز کر سکتے تھے۔

رنگوں کی بھانت بھانت ہی رنگوں کا حسین امتزاج بن گئی تھی۔ وہ ٹیبل جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے بار کے پورشن سے متصل ایک گوشے میں تھا۔ سارا ڈانس روم اور اس کے اطراف کا کھلا ہوا حصّہ جس میں بے شمار میزیں اور کرسیاں تھیں اور جن پر بے شمار دل دھڑک رہے تھے، دور دور تک ہماری نظروں کی پہنچ میں تھا۔

یہاں بھی صرف قہقہے نہیں تھے ــــ

کچھ تھکی تھکی نظریں بھی مجھ سے ملیں ــــــ
کچھ دبی دبی سسکیاں بھی میرے ہاتھ لگیں ــــــ
کچھ ڈھکے ڈھکے آنسو بھی میرے دامن دل کو بھگو گئے۔
کچھ چھپی چھپی آہیں بھی میرے سینے میں در آئیں ــــــ

ہماری میز کے مقابل کچھ ہی فاصلے پر ہری ساری میں ملبوس ایک عورت کچھ اس ادا سے آئس کریم کھا رہی تھی جیسے آئس کریم بہت گرم ہو، اور اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تھوڑا سا وقت اسے چاہیے۔

اس عورت کی عمر ــــ لیکن میں عمر کس طرح بتا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ عورت کی کوئی عمر ہی نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ وہ پختگی کی اس منزل پر تھی جیسے درخت پر لگا ہوا ایک ایسا پھل ہو جو ہوا کے ایک ہلکے سے جھٹکے سے اپنی شاخ سے الگ ہو سکتا ہو ــــ اس کی جوانی اور آنے والی عمر جسے میں بڑھاپا نہیں کہہ سکتا کچھ سہمے سہمے بڑی احتیاط سے آپس میں گلے ملتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن وہ کسی زمانے میں بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر رہی ہو گی کیوں کہ وہ اب بھی بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر تھی ــــ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا حزن تھا۔ ایسا حزن جو ٹھہر کر، تھم کر بس انتظار ہی انتظار بن گیا ہو۔

میں نے اسے بار بار بڑی غور سے دیکھا تھا ــــ اس وقت بھی جب وہ ناچ رہی تھی اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

اب جب کہ وہ آئس کریم کھا رہی تھی اس وقت بھی وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ویسے اپنی میز پر وہ تنہا نہ تھی۔ ایک اور عورت اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک مرد اس کے مقابل تھا۔ جو اس کو طرح طرح سے رجھا رہا تھا۔
میری ساتھی نے مجھ سے پوچھا۔
"کس کے انتظار میں ہو؟"
میں نے نفی میں اس طرح جواب دیا جیسے مجھے کسی کا انتظار نہیں ہو۔
"ڈارلنگ"۔۔۔ میں نے اس سے معافی چاہی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اسے چوما نہیں حالانکہ وہ سو بار چومنے کی شئے تھی۔
"نام کیا ہے تمھارا؟"
"پولن"
"کیا کرتی ہو؟"
"اسٹنو ٹائپسٹ ہوں"
"کہاں۔۔۔ کسی گورنمنٹ آفس میں؟"
"ہاں۔۔۔"
"پھر اپنے ساتھیوں سے اپنا اتنا بہت سارا حسن کس طرح بچا لیتی ہو"
"ساتھیوں سے اپنا حسن میں نہیں بچاتی۔ اس دفتر کا سب سے بڑا عہدیدار یہ فرض پورا کرتا ہے"
"کس طرح بھلا"
"میں اس کی پیشی کی اسٹنو ہوں"۔۔۔ وہ کچھ رک کر پھر کہنے لگی۔۔۔
"دفتر کے سارے ساتھی مجھے صرف حسرت سے دیکھ لینے پر ہی اکتفا کرتے

ہیں ۔ تجھ سے بات کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں ہوتی"

"اور اگر کوئی تجھ جیسا منچلا بات کرے تو"

"تو میں اسے "لفٹ" نہیں دیتی ۔

"ایک آدھ ایسا بھی ہوگا جو تمھیں لفٹ نہیں دیتا ہوگا لیکن تمھاری نظریں اس تک نہیں پہونچتی ہوں گی"

"ہوگا کوئی ــــ یا اگر میرے آفس میں تم ہوتے تو شاید وہ تمھیں ہوتے"

"میں اس طنز کو سمجھ رہا تھا"

"یہاں اب مجھے کھل کر مسکرانے کی ضرورت تھی بلکہ اسے چومنے کی بھی"

لیکن میں صرف مسکرا سکا ــــ چوم نہ سکا ــــ

"میں ہوتا تو تمھارے پاس کے سامنے بیٹھ کر بے اندازہ محبت کی باتیں کرتا ــــ" میں اس سے اور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایک دم اٹھ کھڑا ہوا جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو

شاید نینسی واپس آگئی تھی ــــ

ــــ میں نے بہت تلاش کیا ۔ میری نظریں گوشے گوشے میں بھٹکتی رہیں ۔

ــــ لیکن وہ نینسی نہیں تھی جس کو میں نینسی سمجھ بیٹھا تھا ۔

"کیا دیکھ رہے ہو"

"ایک دوست کو"

"گرل فرنڈ ہوگی کوئی"

"اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم جل جاؤگی"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ـــ کہنے لگی۔

"یہاں عورتیں عورتوں کی دوست بن جاتی ہیں اور مرد، مرد کے رقیب۔"

"کافی سمجھ دار ہو ـــ مجھے پھر ملنا پڑے گا تم سے ـــ ملو گی؟"

"ہاں ـــ" اس نے وعدہ کی قطعیت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اور جب وعدہ ہو چکا تو آرکسٹرا شروع ہو چکا تھا ـــ

اس نے مجھے کھینچا۔

میں اب ڈانس کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس کی کمر میں اپنی گرفت کو مضبوط رکھا تاکہ اس کو میری بے دلی کا احساس نہ ہو۔

کوئی منٹ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ کس نے مجھے ٹیپ کیا۔

اور میں فوراً ڈانس روم سے باہر نکل آیا ـــ اور دوسری میز پر جا بیٹھا تاکہ ہیلن کے لیے مجھے دیکھ سکنے کا امکان کم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ رقص میں رنگ آ رہا تھا۔ گرمی آ رہی تھی، زندگی آ رہی تھی۔

چھت کے قریب رنگ برنگے بیلون ربن کو چوم رہے تھے اور اس طرح رنگوں کا ایک رقص ڈانس روم کے فرش سے بلندی پر ہو رہا تھا جو انسان کی پہنچ سے باہر تھا۔ جو دوستی اور رقابت کے جذبوں سے بلند تر تھا۔

عرش تا فرش رنگوں کا یہ سیلاب موج در موج امڈ رہا تھا۔

نیا سال اب آنے کو ہی تھا۔

آرکسٹرا نئے سال کی سواگت کے لیے اپنی لے کو تیز تر کر رہا تھا ـــ

ڈانس روم کے فرش پر تیز تیز تھرکتے ہوئے قدموں کی پر آہنگ کھٹ کھٹ آرکسٹرا کی لے سے لے ملا رہی تھی۔

اور یہیں نئے سال کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

پولن ایک چینی لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔

ہری ساری والی وہ عورت بڑی گرم جوشی سے کسی کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں اب وہ حزن دور دور تک نہیں تھا جو میں کچھ ہی دیر پہلے اس کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔

شاید وہ شخص اسے مل گیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔

ایک چھریری سی لڑکی ایک چھریرے سے لڑکے کے ساتھ سب سے زیادہ گرمجوشی دکھا رہی تھی۔ دونوں ہی معمولی شکل وصورت کے تھے لیکن اس بھرے پورے ڈانس روم میں وہ سب سے زیادہ مطمئن دکھائی دیتے تھے۔

ایک سکھ نوجوان ایک مسلم لڑکی کو بڑے چاؤ سے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے ناچ رہا تھا۔

یہاں صرف عورت تھی، مرد تھا، یہاں صرف پیار تھا، جذبہ تھا، یہاں رقابت بھی تھی لیکن یہاں مذہب کہیں نہیں تھا۔

پتہ نہیں ان میں سے کتنے اپنے بازو ایک دوسرے کی کمر میں ڈالے۔ اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے کسی اور ہی کے متعلق سوچ رہے ہوں جو شاید اس ڈانس روم میں ہو ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو کسی اور ہی کے ساتھ ـــ ایک دوسرے سے اتنا قریب ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دور ـــ یہاں قرب و دوری کا

نئے سال کی آمد کا منتظر تھا —

— اور میرا رواں رواں نینسی نینسی پکار رہا تھا —

میرے گلاس میں وہسکی کا صرف ایک گھونٹ باقی رہ گیا تھا —

اور میں اپنے چہرے کا تل اس وہسکی میں دیکھ سکتا تھا —

اور اس تل پر نینسی کے بوسوں کی حدت کو اب تک محسوس کر سکتا تھا —

نینسی یہاں نہیں تھی — وہ نئے سال کا انتظار کیے بغیر جا کی کے ساتھ

چلی گئی تھی۔

میں جب پر سیز میں داخل ہوا تھا تو زندگی میں کتنا حسن داخل ہوا تھا

ت کس قدر خوبصورت تھا، لمحے کیسا سج دھج کر میرے آگے سے گزر رہے

۔

اور اب دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کیا ہو گیا تھا — یہاں تو وہی سب کچھ

لیکن نینسی نے شاید زندگی کو دیکھنے کے سارے زاویے بدل کر رکھ دیے

۔

باہر کا جگمگاتا ہوا ماحول میرے سینے میں چھپی ہوئی اداسیوں میں پناہ

رہا تھا — خارجیت غیر محسوس طور پر میری داخلیت میں جذب ہو رہی

—

میری ساڑی والی عورت نے جیسے اپنی آنکھوں کا سارا حزن مجھے سونپ

دیا تھا۔

نینسی یوں بہت دنوں سے مجھ سے نہیں مل رہی تھی —

مجھے معلوم تھا کہ جا کی ان دنوں اپنا سارا پیار اس پر نچھاور کر رہا تھا
میں یہ بھی جانتا تھا کہ نینسی اس پیار کو بڑی بیتن سے سمیٹ رہی تھی۔
لیکن میں کبھی اس سے مل لیتا تو وہ مجھے نظر انداز نہ کرتی۔
اس کے باوجود اب میرے لیے نینسی ہی کیا تھا۔
ویسے اس کی شخصیت میرے لیے رقص گاہوں، سینما گھروں، رسٹورانوں،
اور پارکوں ہی میں قابلِ توجہ رہی تھی۔
جیب سبک ہوتی تو مجھے کبھی نینسی کا خیال ہی نہ آتا۔
جیب کا بوجھ مجھے اکساتا تو اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے نینسی کی مدد کی
مجھے ضرورت پڑتی۔
لیکن آج نینسی مجھے حاصل نہ تھی ——— تو
لیکن آج نینسی مجھ سے چھینی جا رہی تھی ——— تو
میری نہ صرف دلچسپی اس میں بڑھ رہی تھی بلکہ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
نینسی میرے لیے اور بھی کچھ تھی ———

جیسے ———
نینسی میری ادا سی بن سکتی ہے ———
نینسی میری محرومی بن سکتی ہے ———
نینسی میرا غم بن سکتی ہے ———
——— اور میں اٹھ اٹھ کر رقص گاہ میں داخل ہو گیا تھا تاکہ اس سچائی کو
ملا دوں اگر یہ سچائی ہے ———

ایک لڑکی پر نظریں جم کر رہ گئیں جو شلوار اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کرتے پر بڑے بڑے پھول تھے پھولوں کا رنگ لال تھا ـــــ وہ گلاب سے زیادہ خوبصورت تھے اور ان میں دنیا کے پھولوں سے زیادہ خوشبو تھی یا پھر میں کچھ اسی طرح محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خاصی اچھی تھی۔ اس کا سارا حسن اس کے بدن میں سمٹ کر رہ گیا تھا بدن جو بولتا تھا۔ بدن جو سازشیں کرتا تھا اور میں اس بدن سے قریب ہو گیا تاکہ بنفسی کے خلاف سازش کر سکوں۔ اسے جھٹلا سکوں۔

جب تک وہ میرے ساتھ رہی میں بڑی گرمجوشی سے اسکے ساتھ ناچتا رہا۔ جب وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میں نے سوچا کہ آنکھ بند کر کے جو بھی پاس سے گزرے اسے ٹچ کر دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک دلچسپی کا مشغلہ سہی ـــــ

سو میں نے کیا ـــــ ایک سردار جی دو قدم پیچھے ہٹ آئے۔

میں نے آگے بڑھ کر عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کی کمر کہیں نہیں ملی ـــــ ایک آنارج کی بوری تھی جسے میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ میں بوکھلا سا گیا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ مجھے اپنے دماغ کو اس کی سانسوں سے بچانے میں بڑی مردانگی بتانی پڑی۔ ہم ناچ کیا کر رہے تھے ـــــ بس کبھی دائیں دو قدم بائیں جھوم رہے تھے بلکہ یوں کہیے ہاتھی کی طرح جھول رہے تھے ـــــ اس ہاتھی ہی کی طرح جس کا مہاوت اس کی سونڈ سہلا کر اسے بچکار رہا ہو ـــــ میری کسمپرسی دیدنی تھی۔ میں نے بڑی حسرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مرد مجاہد نہ تھا جو میری طرف بڑھے اور اس "فربہ اندام" حسینہ کو میری باہنوں سے جدا کرے۔

سردار جی بجائے کسی اور کے ساتھ ناچنے کے قریب ہی ایک کونے میں کھڑے ہمیں تاک رہے تھے۔ میری نظر ان پر پڑی تو میں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور میں نے شکریے کے ساتھ ان کی بوری جوں کی توں ان کے حوالے کر دی ـــــ اور جب تک میں اس بوری کے ساتھ رہا ہوں اس پورے وقت میں نینسی مجھے یاد ہی نہیں آئی ـــــ لیکن نینسی کی یاد سے بچنے کے لیے میں بار بار خودکشی کیسے کر سکتا تھا ـــــ

اس حادثے نے میرا رہا سہا سکون بھی چھین لیا ـــــ

جی جیسے ہر چیز سے اوب گیا ہو ـــــ

گلابی رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئی ایک حسینہ جو انگلش اور انڈین نسل کی آمیزش معلوم ہوتی تھی ایک بہت ہی بانکے اور سجیلے نوجوان کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ وہ کچھ اس قدر انہماک سے ناچ رہے تھے کہ انھیں منٹ بھر کے لیے جدا کرنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن وہ جب میرے مقابل آگئے تو میں نے آرکسٹرا کے اشارے کو غنیمت سمجھا ـــــ نوجوان نے اس کی کوئی پروا نہ کی ـــــ ظاہر ہے مجھے یہ بھی تو گوارا نہ تھا کہ تہذیب سے گری ہوئی اس کی اس حرکت کو سہہ لیتا ـــــ

میں نے ذرا فورس سے پھر ٹیگ کیا۔

نوجوان ہٹ آیا۔

مگر بلڈ حسینہ میری بانہوں میں تھی۔ اس کے کپڑوں سے بھینی بھینی سی خوشبو پھوٹ رہی تھی اور یہ خوشبو مجھے نینسی کی یاد دلا رہی تھی اور نینسی کی یاد مجھے پھر اداس کر رہی تھی ـــــ

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے ہی ساتھ ناچ رہا ہوں۔
حسینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ میرے ساتھ ناچتے ہوئے انھیں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں نے اس کی چھلکتی ہوئی آنکھیں صاف طور پر دیکھ لی تھیں۔
جب میں اس سے جدا ہوا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں سنسنی سے جدا ہو رہا ہوں — جیسے خود اپنے آپ سے جدا ہو رہا ہوں۔
میں اس طرح ڈانس ہال سے چلا آیا جیسے میں خود نہیں چل رہا ہوں کوئی مجھے کھینچے لیے جا رہا ہے۔
میری نظر جہانگیر پر پڑی جو کبھی میرا کلاس فیلو تھا۔ اس نے مجھے وش کیا وہ اس حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا جس کا بدن بولتا ہے۔ جس کا بدن سازش کرتا ہے۔
وہ حسینہ جس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی ہے اور جو اپنی آنکھوں میں بڑی احتیاط سے آنسو چھپائے رکھتی ہے پھر اسی بانکے اور سجیلے نوجوان کے ساتھ ناچ رہی تھی جو خود بھی شاید اس کے آنسوؤں کی حفاظت کرتا ہے۔
سردار جی کو غالباً میں نے دہشت بھلا دیا جو اپنی غلّے کی بوری سمیٹے ہوئے کہیں ہوں گے —
دولہن البتہ ایک بڑے وجیہہ سکھ نوجوان کے ساتھ ناچ رہی تھی —
میں نے ہاف پاگ کے لیے بیرے سے کہا اور سگریٹ جلا کر ایک میز سنبھال لی ....
ڈانس ہال میں خوشیاں زیادہ تھیں۔ غم کہیں کہیں تھا جیسے خوشیوں کی پورش

سے چھپتا پھر رہا ہو۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میں بھی چھپتا پھر رہا ہوں۔

میں نے کبھی رہائی کو رقابت کے جذبے سے نہیں دیکھا تھا۔

نہیں جب وہ دوسری دفعہ مجھ سے بار میں ملا تھا۔ جب کہ ننسی
نہیں اسی کے ساتھ تھی۔ لیکن باتیں کرتے کرتے ننسی نے مجھے پھر ایسے
دیکھا تھا جیسے چار یا پانچ دن سے مجھ سے بالکل نہ ملنے پر ندامت محسوس
ویسے روزانہ ہم کم ہی ملتے تھے۔ لیکن شام کے وقت کہیں نہ کہیں تو مل

جائی اس سال کی سیزن ریس میں دہرہ دون سے آیا ہوا تھا ا
ہو جانے پر بھی اب تک یہیں تھا۔ اس سے ننسی کی پہلی ملاقات میرے
ڈانس میں ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ اس نے
اس کو سر راہ کئی بار جائی کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور
نظر آنی [illegible] اور بہت ہی خوبصورت کپڑوں میں ملبوس نظر آتی
ہوا کہ صبح کو پہنا ہوا اسکرٹ میں نے شام کو اس کے سجیلے بدن پر نہیں
اس کا یہ بناؤ سنگار جہاں جائی کی خوشحالی کی نشاندہی کرتا تھا وہیں
کا احساس بھی دلاتا تھا ۔۔۔ میں نے خود کو اس طرح تسلی دے لی کہ چلو
دوست کا مستقبل مسرتوں کے گلے میں باہیں ڈالے زندگی سے پیار
میں نے کوشلیا کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی جو ایک خانگی انسٹی ٹیوٹ
میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ جو بہت شرمیلی تھی۔ جو چوم لینے سے عزت
تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جائی ننسی پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا ہے

میٹنگ میں اس کے ساتھ ریس کورس جاتے لگی ہے ۔ کبھی کبھی اس کی علاتی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے جو قریباً اس کی ہم عمر ہے اور اس کا باپ بھی جو ماں اور بیٹی سے دوگنی عمر کھا چکا ہے ۔ مجھے اس کا بھی پتہ چلا کہ یہ لوگ ریس کھیل بھی لیتے ہیں اور یہ سب جاکی ہی کی جیب کا رہین منت ہے ۔

مجھے ان ساری باتوں کو سن کر بھی کبھی جاکی سے رقابت نہ ہوئی۔ اس کی وجوہات شاید یہ ہوں کہ ــــ

زندگی کی رقص گاہ میں نینسی میرے لیے ایک ایسا ساتھی تھی جو صرف ٹیک کرنے پر مجھ سے جدا ہو جاتا ہے ۔

زندگی کے شراب خانے میں نینسی ایک ایسی شراب تھی جس کا حسن ہر جام میں ڈھل جاتا ہے اور جس کی حرارت ہر شیشے کو پگھلا دیتی ہے ۔

میں اس کے پیچھے اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے ایک بچہ تتلی کے پیچھے وقت اور فاصلے کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہے۔ لیکن آج جب کہ نینسی مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی تو مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں شاید اس کے تعاقب میں بہت دور نکل آیا ہوں ۔

اور آج میں جاکی کو کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرے گھر آیا تو میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اس کو خوش آمدید کہا، اس کی تواضع کی لیکن جب اس کو وداع کرنے کے لیے اٹھا تو وہ پچھلے دروازے سے جا چکا تھا اور مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میرے گھر میں کوئی پچھلا دروازہ بھی ہے ۔

اور آج اسی پچھلے دروازے سے نینسی میرے نہاں خانۂ دل میں داخل

ہو رہی تھی ــــ

وہی نینسی جو رقص گاہ سے مجھ سے ملے بغیر جاکی کے ہمراہ کہیں چلی گئی تھی۔
وہی نینسی جس کا آج سے پہلے اس طرح میں نے کبھی انتظار نہیں کیا تھا۔
میں اپنی میز پر بیٹھا بیٹھا ڈانس ہال کے جگمگاتے ماحول سے بے نیاز جانے کہاں کہاں رہا۔ لیکن میں پھر رقص گاہ میں لوٹ آیا تھا۔ میرے گلاس میں ابھی تھوڑی سی وہسکی باقی تھی۔

میں نے وہسکی ختم کرلی اور ڈانس ہال میں جانے کے لیے اٹھا۔
میں نے دیکھا نینسی سگریٹ کے دھویں کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے ڈانس ہال کے بیچ صحن میں کھڑی ..... کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جاکی اس کے ساتھ نہ تھا اور دھویں کی چادر آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ نمایاں ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔
کسی بے نام سی خوشی نے مجھے لمحے بھر کے لیے گدگدا کر چھوڑ دیا۔ نینسی نے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا ــــ وہ جاکی کو کہیں چھوڑ کر میرے پاس چلی آئی تھی، اور یہ خیال میرے ان سارے جذبوں کو جھٹلا رہا تھا جو اس کے غیاب نے مجھ میں پیدا کر دیے تھے۔
لیکن میں چاہتا تھا کہ نینسی ایسی کوئی بات محسوس ہی نہ کرے ــــ
میں اس کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے اپنی ساری دلچسپیوں کا اس کی خاطر خون کر رہا ہوں ــــ میں اس کے قریب پہونچا تو اس نے میرا ہاتھ تھام

کر مجھ سے باہر چلنے کے لیے کہا۔

اس کا گلہ رندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

جب ہم پر سیز سے باہر نکل گئے تو آپس میں کچھ کہے سنے بغیر چلتے رہے۔ ریس کورس کے قریب پہونچ کر وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ میں نے اس کو اپنی باہوں میں لے کر اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی اداسی کا سبب پوچھا۔

جی چاہا اسے بتلا دوں کہ میں بھی اس کے لیے اتنا ہی اداس تھا۔

جی چاہا اسے بتلا دوں کہ آج جب مجھے اس کی جدائی کا احساس ہوا تو میں ایسے ہونٹوں کو بھی نہیں چوم سکا ہوں جو میرے لیے پھول کی طرح کھل رہے تھے۔

لیکن میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔

صرف اس کیفیت کو چھپاتا رہا جو آنسو بن کر ساری ہستی پر چھا جاتی ہے۔

ہنسی کچھ بولنا چاہتی تھی۔

اور میں سب کچھ سن لینا چاہتا تھا۔

اس نے بہت ہی آہستہ سے کہا جیسے بہت بلندی سے بول رہی ہو اور میں اس کی آواز کے آبشار کے نیچے کھڑا اپنی آنکھیں بھگو رہا تھا، اپنا دل بھگو رہا تھا۔

"جاکی سسٹر کو لے کر بھاگ گیا ہے (وہ اپنی علاتی ماں کو سسٹر پکارتی تھی) وہ کہہ گئے ہیں کہ میں تین چار دن تک ڈیڈی کو کسی طرح دھو کے میں؟

رکھوں ۔۔۔ میں ایسا کس طرح کر سکتی ہوں ۔ لیکن اسے یقین ہے کہ ہر کام لے سکتا ہے ۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے صرف ایک بار گیا ہے کہ میں تم سے کہہ دوں کہ وہ تمھارے پھول کو اپنے کوٹ سجا سکتا ۔

میں نے پھر محسوس کیا کہ نینسی میرے گھر اسی پچھلے دروازے ہو رہی ہے جس دروازے سے کبھی جاکی باہر نکل گیا تھا ۔
میں نے محسوس کیا کہ نینسی میرے لیے نہیں آئی اس کی مجبوری لیے آئی ہے ۔۔۔
اس کی لٹی ہوئی محبت میرے لیے آئی ہے ۔۔۔
نینسی تو جاکی کے ساتھ جا چکی تھی ۔۔۔
کوئی مجھ سے سرگوشی کرنے لگا ۔۔۔ تم بھی تو اس نینسی کے ہو ۔ تم کبھی تو اس نینسی کے ساتھ جا چکے ہو ۔ لیکن میں جواب بھی نہ دے
"یہ جھوٹ ہے ، یہ جھوٹ ہے"

پرسینر سے آرکسٹرا کی مدھم مدھم سے ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر بہہ بج رہی تھی ۔ ساتھ ہی کچھ ایسی آوازیں بھی تھیں جس سے اس بات کا ہوتا تھا کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے ۔ پرسینر میں لوگ نئے سال کو گلے اٹھا کر ناچ رہے ہوں گے ۔۔۔ جاکی کا موٹر ہواؤں سے باتیں کر رہا ہوگا مسز جاکی سے لگی ہوئی سوچ رہی ہوگی کہ اس کا بوڑھا شوہر خواب میں سال سے گلے مل رہا ہے ۔

موڑ پر گرے ہوئے سینسی کے آنسو اب خشک ہو گئے ہوں گے اور ان پر گرد جم گئی ہو گی۔

مجھے خاموش پا کر سینسی نے مجھے دیکھا۔

میں نے نظریں جھکا لیں ——— پھر میں نے کچھ رک کر کہا سینسی نیا سال شروع ہو چکا ہے ———

وہ بڑھی اس نے اپنا سر پھر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میری قمیص اس کے آنسوؤں سے نم ہو چکی تھی۔

پھر یکایک وہ سنبھل کر پیچھے ہٹی۔ رک کر میرے کوٹ کے بٹن درست کیے ——— پھر خلاؤں میں کچھ دیکھا اور دو قدم بڑھ کر نئے سال کا جنازہ اس نے اپنے کندھے پر بڑی احتیاط سے اٹھا لیا۔

میں نے اس بوجھ کے اٹھانے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

بس کھڑا ہوا چپ چاپ دیکھتا رہا ———

یہاں تک کہ وہ ٹیکسی میں سوار ہو چکی تھی۔

میں تو سدا کا تماشائی ہوں۔

شعور سفر منزل

شعور

"قنبر علی کی گھوڑی میری"
"شیخ محبوب کا گھوڑا میرا"

"سید ابراہیم کا تازی اسپ میرا"
"اور بھیا آپ کچھ نہیں لیتے — ؟"

"بانو میری، بانو میری، بانو میری — بھیا بانو کو تاکتے ہوئے اس طرح کہتے کہ وہ ان کی آواز سن لیتی اور نیچی نیچی نظروں سے انھیں دیکھتی ہوئی پرے ہٹ جاتی۔

"نیا صوفہ سیٹ میرا"
"ڈریسنگ ٹیبل میرا"

اس طرح نہیں بھئی پہلے ڈرائنگ روم کا سامان بانٹ لیں ـــــ کوئی معترض ہوتا۔

"اچھا بھئی شیشم کی چھ کرسیاں میری"

"قالین میرا"

ٹنکو تالیاں بجا کر ناچنے لگتا۔ واقعی قالین پر کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ ڈرائنگ روم کی سب سے بڑھیا شے تو وہی قالین تھا۔ دادا ابا جب مشرق وسطیٰ کے دورے پر گئے تھے تو ایران سے لے آئے تھے۔

"بھئی میرے لیے تم لوگوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا ـــ" پتہ نہیں مالِ غنیمت تقسیم ہوتا رہتا تو بھیا کہاں سے آدھمکتے۔

"بھیا اتنی ڈھیروں سی چیزیں۔ پسند کیجیے نا بھلا"

وہ کچھ اِدھر اُدھر دیکھتے۔ جیسے ساری چیزوں کو بغور دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں پرکھ رہے ہوں۔ پھر ایک دم دبی دبی آواز میں پکار اٹھتے۔

"بانو میری، بانو میری، بانو میری"

ہم سب احتجاج کرتے۔ جو چیزیں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں تقسیم ان ہی میں سے ہونی چاہیے ـــ

وہ مان جاتے "ہاں بھئی تقسیم ان ہی میں سے ہوگی"

"پھر بانو کہاں ہے؟"

"بانو کہاں نہیں ہے؟" وہ نہیں پر زور دیتے۔

"یہاں نہیں ہے، ڈرائنگ روم میں نہیں ہے"

"کیوں؟۔۔۔"

"آدمی تقسیم ہوں تو آپ بانٹ کر لے سکتے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آدمی تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔"

"کب؟"

"ابھی، اسی وقت۔"

"ابا میرے۔"

"امی میری۔"

"باجی ہماری۔"

"پھوپی خالہ بھیا کی، پھوپی خالہ بھیا کی۔" ہم پکار اٹھے۔

بھیا اس طرح ... دیکھ رہے جیسے کچھ نہیں سمجھ رہے۔۔۔ "تم لوگ کون ہوتے ہو پھوپی خالہ کو میرے حوالے کرنے والے۔ ہم تو وہی چیز لیں گے جو ہم کو دلپسند ہو۔"

"بیچاری پھوپی خالہ کو کون لیں گے؟"

"لے لیں گے کوئی پھوپھا خالو آکر" ہم کھل کھل ہنس پڑے۔

"ارے ٹھہرو تو سہی ذرا۔"

"نا بھئی انھیں کون پالے، بھلا کون کھلائے گا دن میں دو دو وقت۔"

اور ہم سب بیٹھے پوچھتے رہ گئے۔ "ارے وہ بھیا آپ کو ایک اچھی سی چیز؟" کوئی اچھی سی بڑی چیز دے دو، تکے اٹھا کر تو ایک ایک کو ایک ایک ٹافی پر چڑھا دوں گا۔

"نہیں بہت عمدہ چیز دیں گے"

"ایک دم بڑھیا —" !!

"ہاں ہاں بالکل —"

"اچھا دے دو بھئی — دیکھیں تو کیا دیتے ہو"

"بانو بھیا کی، بانو بھیا کی، بانو بھیا کی"

گھر کی ایک ایک چیز جب اس طرح تقسیم ہو جاتی تو ہر چیز کا مالک اس پر اپنا اپنا حق اس طرح جتلاتا کہ اسکی بغیر اجازت وہ چیز استعمال ہی نہیں کی جا سکتی تھی — منی کو اپنے صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو ٹنکو میاں سے اجازت حاصل کرنی ہوتی کہ وہ قالین پر سے چل کر صوفے تک پہونچے — ورنہ ٹنکو میاں صاف ٹوک دیتے۔ اور منی قالین سے بچ بچ کر صوفے کے ہتھے کے قریب پہونچ کر چھوٹی سی کتیا کی طرح اچھل کر صوفے پر جا براجتی۔ اور بڑی احتیاط سے اپنے پیر سمیٹ لیتی کہ مبادا پیر قالین سے مس نہ ہو جائیں۔ ایسے میں بیچارے ٹنکو میاں کو بھی قالین ہی پر براجنا ہوتا اور انہیں صوفے پر بیٹھنے کی اجازت نہ ملتی۔

"منی —"

"جی بھیا —"

"یہ ٹنکو میاں بیچارے غلاموں کی طرح نیچے کیوں بٹھا دیے گئے"

ٹنکو میاں ناک بھوں چڑھاتے — بھلا وہ اور منی کے غلام کہلائے جائیں۔

بھیا کو بھی قالین پر قدم رکھنے سے وہ روک دیتے اور جھٹ سے قالین پر کھڑے ہو جاتے، پھر ٹہلنے لگتے۔

"بھئی ہم تو ٹنکو میاں کی طرح اپنی چیز کو چھونے سے کسی کو بھی نہیں روکتے ہے۔"

"پھر منی جو مجھے صوفے پر نہیں بیٹھنے دیتی ہے" ٹنکو میاں شکایت کرتے۔
"اور جو تم قالین پر پیر بھی دھرنے نہیں دیتے" منی جواباً انہیں لتاڑتی۔
ٹنکو میاں ہم تمھارے قالین پر سے ہو کر منی رانی کے صوفے تک پہنچ جائیں؟"
ٹنکو میاں بڑھ کر بھیا کا ہاتھ پکڑے انہیں گھسیٹتے اور اس طرح وہ منی رانی صوفے تک بخیریت پہنچ جاتے ـــــ صوفے پر بیٹھ کر وہ بغور ادھر ادھر دیکھنے لگتے ـــــ پھر اطمینان سے سگریٹ جلا کر ایک لمبا سا کش لیتے اور سامنے بے شمار گول گول دھوئیں کے حلقے بکھر جاتے ـــــ ٹنکو اور منی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دھوئیں کے حلقوں میں اپنے ہاتھ اس طرح داخل کرتے جیسے وہ سارے دائروں کو محفوظ کر لیں گے ـــــ بھیا سگریٹ کا لطف اٹھاتے جاتے اور کن انکھیوں سے دروازوں میں کچھ تلاش کرتے رہتے۔
ہم سمجھ جاتے۔ بھیا بھی کون سے ایسے بڑے بزرگ تھے۔ امی تو کل ہی کی تو بات ہے کہ سگریٹ نوشی پر ان کے کان اینٹھے تھے ـــــ میں ذرا شہر جا کر بیٹھ نہیں کون سے کالج میں پڑھنے لگے تھے وہ ـــــ ابھی تو ان کے داڑھی بھی نہ ابا کی طرح بڑی بڑی مونچھیں ـــــ دھان پان سے پھچھوندی مولی سے لگتے تھے ہمیں ـــــ امی سے پٹ چھوٹا تو لگے کونے میں لے جا کر ہماری منتیں کرنے۔
"یا تو سے نہ کہنا کہ امی نے ہمارے کان اینٹھے ہیں۔"

ہم لوگ پتہ نہیں یہ بات بانو سے کہہ دیتے یا نہ بھی کہتے ــــ لیکن بھیا جب اس طرح منتیں کرنے لگے تو ہمیں بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔

"پھر نکالیے چاکلیٹ" منی چلائی۔

"ورنہ ہیں بانو سے" ٹنکو میاں نے دھونس جمائی۔

"اچھا جی" انھوں نے بازوؤں سے پکڑ کر ایک ایک کو اٹھا لیا اور الماری پر چڑھا کر چل دیے۔

ٹنکو میاں بے چارے کیسے سہمے ہوئے تھے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ منی شروع شروع تو کچھ لطف اٹھاتی رہی ــــ جانے الماری کا پیٹ کس طرح کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اڑا اڑا دھم دیکھتے دیکھتے زمین پر آ رہے گی۔ ایک دم منی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ٹنکو میاں پر رقت طاری ہو گئی اور جب بھیا الماری کے برابر سے نکل آئے تو ٹنکو میاں کی آنکھیں جھرنے کی طرح جھر جھر بہہ رہی تھیں۔

یہ الماری پر بٹھا دینے کی سزائیں آج یاد آتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ کوئی وہ عمر پل بھر کے لیے لوٹا دے۔

آج پھر ہم سب کے لیے رت جگا تھا۔ ابا صبح ہوتے ہوتے دورے کے لیے نکلنے والے تھے۔ امی اور ہم سب کے سب ساتھ تھے۔ دل میں پھلجھڑیاں سی چھٹ رہی تھیں ــــ کتنے ہی بار ہم بستروں پر بھجوائے گئے ــــ لیکن نیند تھی کہ آنکھوں سے سمجھوتہ ہی نہ کر پاتی تھی۔ رضائیوں سے چہرے نکالے ہم سارے گھر کا جائزہ لیتے۔ بانو آپا انتظام میں مصروف تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ہم بانو کو

ذ آپا پکارنے لگے تھے۔ بھیا نے کہہ رکھا تھا کہ اگر انھیں بانو آپا نہ پکارا جائے گا
وہ سب کے حقوق تلف کرتے پھریں گے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ ٹنکو میاں
، قالین کو ان کی اجازت کے بغیر جوتوں سے روندیں گے۔۔۔ منی کے
دفتے پر اپنے فونٹن پن کی روشنائی انڈیل دیں گے۔۔۔ پھر یہ بھی تاکید تھی کہ
ں اگر پوچھیں تو انھیں بتلایا نہ جائے کہ بھیا نے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔
ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بانو آپا ادھر کچھ دنوں سے ہمیں کچھ
وہ ہی اچھی لگنے لگی تھیں۔۔۔ بھیا کے سوٹ کیس سے چاکلیٹ نکال کر ہمیں
یں ان سے دے دیتیں جیسے وہ بھی اس سوٹ کیس کی مالکن ہوں۔
ٹنکو میاں کہتے جلدی کیجئے بانو آپا بھیا دیکھ لیں گے کہیں۔
وہ مسکراتیں۔ کیوں کیا تمھیں تمہارے بھیا کا ڈر ہے۔
ٹنکو میاں کچھ حیران سے رہ جاتے۔ لوتی دن دھاڑے سوٹ کیس
ھول کر چاکلیٹ نکال رہی ہیں۔ پھر نہ ڈر نہ خوف۔
لیکن آہستہ آہستہ ٹنکو میاں سمجھ گئے کہ بانو آپا چاکلیٹ تو کیا سارے کا
را سوٹ کیس اٹھا کر جس کسی کو چاہے دے سکتی ہیں۔ یہ حق انھیں کس نے
یا تھا۔ وہ نہ منی کی سمجھ میں آیا، نہ ٹنکو میاں کی۔
رضائی کو پرے پھینکتے ہوئے ٹنکو میاں نے بانو آپا کو تاکا جو ڈالا لئے
ڑی ناشتے کی چیزیں ہاٹ کیس اور ٹفن باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔
شیٹ۔شٹ۔۔۔ اور بانو آپا نے گھوم کر دیکھا۔
ٹنکو میاں نے اشارہ دل ہی اشارہ ذہن میں انھیں ہموار کر لیا کہ رضائی پھینک کر

بستر سے کود پڑیں۔

منی بھی رضائی سے منہ نکالے مٹ مٹ ساری باتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بانو آپا کی اجازت مل جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ ابا، امی اور خالہ بی سب کی سب سو چکی ہیں۔

ٹنکو میاں آگے آگے تھے پیچھے منی رانی۔

"ہاٹ کیس میرے"

"ٹفن باسکٹس میرے" ٹنکو میاں چلائے۔

"لے میرے تیرے کے بچے — بھاگ جا یہاں سے" شور مچایا تو —

لوجی بھیا کو اڑ کی اوٹ میں کھڑے تو لیہ ہاتھ میں لیے پلیٹیں خشک کر کے بانو آپا کو دیتے جا رہے تھے جنھیں وہ بڑے سلیقے سے باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔

بانو آپا نے ایک قاب میں سے بادام کے لوز کا ٹکڑا نکال کر ٹنکو میاں کے منھ میں ٹھونس دیا تو وہ لگے تالیاں بجا بجا کر ناچنے۔

منی نے منھ کھولا تو بانو آپا نے اس کی تواضع کی۔

"چلو اب تم لوگ جلدی سے جا کر اپنے اپنے گرم کوٹ پہن آؤ — سردی نہیں لگ رہی ہے تمھیں ؟" بانو آپا نے بڑے پیار سے حکم دیا۔

ہم جانے لگے تو انھوں نے کہا۔ "بس چپکے سے پہن آنا — کھٹ پھٹ کی تو تمھارے بھیا — اور وہ چپ ہو گئیں۔

الماری کھول کر ہم نے اپنے گرم کوٹ اس طرح نکالے جیسے چوری کر رہے ہوں —
بیل گاڑیاں غالباً احاطہ میں لا کر کھول دی گئی تھیں۔ رات کے سناٹے میں

ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ہمیں صبح کو شروع ہونے والے سفر کے لیے ابھی سے اکسا رہی تھی۔

منی نے گرم کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے شہ دی۔

"میں جاکر اچھی سی بیل گاڑی چن لیتی ہوں۔"

اور ٹنکو میاں سرپٹ بھاگے۔

"لال پہیوں والی بیل گاڑی میری" منی نے اعلان کیا۔

اور ٹنکو میاں دل مسوس کر رہ گئے دوسری بیل گاڑیوں کے پہیے لال تھے ہی نہیں۔

بیل گاڑیاں تقسیم ہو گئیں۔

بیل تقسیم ہو گئے۔

اونگھتے ہوئے گاڑی بان تک تقسیم کر لیے گئے۔

منی بھیا کو خوش خبری سنانے کے لیے بھاگی کہ لال پہیوں کی سب سے اچھی بیل گاڑی اس نے چن لی ہے۔ اور بھیا کی غفلت کے باعث ایک فالتو سی گاڑی ان کے لیے بچ رہی ہے۔

ٹنکو میاں نے بھی بڑی عمدہ سی بیلوں کی جوڑی ہتھیا لی تھی۔ وہ بھلا یہ خوش خبری کس طرح نہ سناتے۔

بھیا کے پاس ہم پہونچے ہیں تو اپنا ایک گرم کوٹ وہ بانو آپا کو پہنا کر اس کا کالر ٹھیک کر رہے تھے اس طرح کہ بانو آپا کا گلا اور کان بھی سردی سے محفوظ ہو جائیں۔ خود انھوں نے بھی ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔

سی ٹکر ٹکر بانو آپا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی اچھی لگ رہی تھیں۔
ٹنکو کہنے لگا۔ اب کی بار آدمیوں کی تقسیم ہو تو میں بانو آپا کو لے لوں گا۔
بھیا نے مسکرا کر بانو آپا کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے اپنی ساری ہستی ان پہ
لٹا رہے ہوں۔

"بانو" یہ ابا کی آواز تھی۔

ہم سب کے سب پاؤں دبا کر بھاگے اور اپنی اپنی رضائیوں میں جا دبکے۔
بانو آپا بہت پھرتی سے بھیا کا گرم کوٹ اتار رہی تھیں اور بھیا کچھ اس
طرح بانو آپا کو تک رہے تھے جیسے اپنی نظروں کے تانے بانے میں بانو آپا کو جکڑ
کر ان کو سردی سے بچا رہے ہوں۔

"بانو" ابا نے پھر پکارا۔

بانو آپا ابا کی خواب گاہ کی طرف لپکیں تو دروازے تک پہنچتے پہنچتے
انھوں نے دو تین بار جھرجھری سی لی اور ان کا نازک سا جسم ایک بار تو اس طرح
کپکپایا جیسے بیچ صحن میں پیوندی آم کے درخت کی وہ ٹہنی جو آموں سے لدی
ہوئی لہک لہک کر چنبیلی کی بیل کو گرما کی شاموں میں چوم چوم لیتی تھی۔
بھیا کے ہاتھوں میں بانو آپا کا اتارا ہوا کوٹ اس طرح جھول رہا تھا جیسے
بھیا، بھیا نہ ہوں بلکہ برآمدے میں دھرا ہوا لکڑی کا وہ اسٹینڈ ہوں جن پر
کوٹ ٹانگے جاتے ہیں۔

جی ہاں ساری چیزیں تیار ہو چکیں —
جی ہاں میں نے سب کچھ رکھ دیا ہے —

جی ہاں ـــــ

ہم نے بہت کوشش کی پھر بھی اتنا ہی سُن سکے۔ اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپا چلنے کی تیاری ہی کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔

بانو آپا باہر نکلیں تو بھیا نے بڑھ کر کوٹ انہیں پھر پہنا دیا۔ وہ اسی طرح شانِ استغنا سے کوٹ پہن کر آگے بڑھ گئیں جیسے یہ ان کا روزانہ کا معمول ہو جیسے بھیا ان کے ادنیٰ ملازم ہوں جو صرف اسی کام کے لیے رکھے گئے ہوں۔

ہمارے دروازے کے قریب پہونچیں تو ہم دم سادھے انہیں تک رہے تھے کسی نے سر سے پیر تک رضائی تان رکھی تھی انھوں نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ سگنل ہمارے لیے ہے۔ ہم نے دیکھا تو وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اس طرح بلا رہی تھیں جیسے غلام احمد اورل کی پیچ پکڑوانے کے لیے فیلڈ ادریخ کرتے ہو

ہم بھاگے بھاگے بانو آپا تک پہونچے تو انھوں نے بڑے تحکمانہ انداز سے کہا ـــــ لائین میں کھڑے ہو جاؤ۔

ہم سب لائین میں کھڑے ہو گئے تو بھیا بھی آکر ہم میں مل گئے ـــــ بانو آپا مسکرائیں، کہنے لگیں، کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر کپڑے پہن کر ہم لوگ تیار ہو جائیں ـــــ

بھیا تعظیماً جھکے۔ دوہرے ہو کر اس بات کا [illegible] وہ بانو آپا کے احکام کی بسر و چشم تعمیل کریں گے۔

ـــــ بھیا کو دیکھ کر ٹنکو میاں بھی جھک پڑے۔

ٹنکو میاں کو دیکھ کر ہم سب جھک پڑے۔ لیکن باندی ٹنکو میاں نے مار دی

تھی۔ بانو آپا نے انھیں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور جھٹ جھٹ دو چھوٹے چھوٹے سے پیار ان کی پیشانی پر جڑ دیے۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بانو آپا اب وہ بانو نہیں رہی تھیں جو کچھ دن پہلے تک سہمی سہمی لجائی لجائی سی ہمارے اور بھیا کے آگے سے گزر جاتیں۔ ان میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی جو بانو آپا کے شایانِ شان تھی اور ہمیں ان کا یہ نیا روپ بہت بھاتا تھا۔

سفر

چاندنی ساری زمین پر پھیل پھیلا کر اس طرح لیٹ گئی تھی کہ اب کبھی سورج طلوع ہوگا نہ اسے شرما اور لجا کر، سکڑنا سمٹنا پڑے گا — رات حسین تھی، رات کی خاموشیاں حسین تھیں۔ دودھیائی چاندنی میں آہستہ آہستہ منزل کی جانب بڑھنے والا ہمارا قافلہ — سناٹوں اور خاموشیوں کی دنیا میں آواز اور زندگی تقسیم کر رہا تھا۔ ایک جانب ہرے ہرے کھیت دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری سمت ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے نشیب میں لوگ کہتے ہیں کہ شیو جی کا مندر ہے مندر کے پیچھے لوگ کہتے ہیں ایک ندی بہتی ہے جس کا پانی اس قدر میٹھا ہے کہ گھلی ہوئی مصری معلوم دیتا ہے — ہاں اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کے اولاد نہیں ہوتی وہ اس ندی کا پانی پی لے تو اس کے اولاد ہو جانا یقینی ہے — خالہ بی کی مرغی بانجھ ہے۔ منی یقیناً سوچ رہی ہے کہ وہ خالہ بی سے کہے گی کہ وہ اپنی کلموہی مرغی کو اس ندیا کا پانی چٹوا آئے — اس نے ٹھنکو میاں سے اس بات کا تذکرہ کیا ہے — ٹھنکو میاں کچھ سوچ رہے ہیں —

پھر یکایک چونک کر انھوں نے منی سے پوچھا ہے۔

"منی دیدی! اگر خالہ بی کو بھی اس ندیا کا پانی پلادیں تو ہمارے پاس بھی بچے ہو جائیں گے نا!؟"

ٹنکو میاں، منی پر مہربان ہیں۔ تب ہی تو منی دیدی کہا ہے ـــــ بات ٹنکو میاں نے معقول کی ہے ـــــ منی کو یاد آیا کہ واقعی خود خالہ بی بھی تو بے اولاد ہیں ـــــ اور یہ بات ساری بیل گاڑی میں پھلجھڑیاں چھوڑ دا رہی ہے ـــــ سب ہنس رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قہقہے ننھی ننھی کلکاریاں، بیلوں کی گھنٹیوں کی سریلی ٹن ٹنا ٹن ـــــ پہیوں کی چرخ چوں۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی ٹپ ٹپ ـــــ آوازوں کا یہ قافلہ خاموشیوں کے سینے میں اتر رہا ہے ـــــ دو متضاد کیفیتیں اپنا تضاد کھو رہی ہیں۔ جہاں مختلف آوازوں کے اس قافلے پر دودھیائی چاندنی میں سوئے ہوئے سناٹے کا گمان گزرتا ہے تو کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری چٹکی ہوئی چاندنی بول رہی ہے۔ کھیت بول رہے ہیں۔ جھومتے جھامتے درخت بول رہے ہیں۔ وہ پہاڑی بول رہی ہے جس کے نیچے شیو جی کا مندر ہے اور اس مندر تک پہونچانے والی پگڈنڈی بول رہی ہے ـــــ سب چپ چاپ ہیں لیکن کائنات کی ہر شے کوئی خوبصورت سی سازش کر رہی ہے اور یہ سازش غالباً چٹکی ہوئی دودھ جیسی چاندنی کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس کے حسین نشاط کے خلاف ہو رہی ہے جو اس نے جنگل کی ہر شے پر جما رکھا ہے اور غالباً اس سازش ہی کے نتیجے میں سورج کہیں دور دبا دیا، چھپا چھپا چاندنی کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا ہو ـــــ لیکن وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز ہے۔ اپنے ہی

حسن میں مگن۔

بانو آپا ہماری ہی بیل گاڑی میں بچوں میں گھری بیٹھی ہیں —— اچھی اچھی باتیں، میٹھی میٹھی باتیں —— سبز پری کی کہانی جس کو کالے دیو سے چھڑانے کے لیے شہزادہ گلفام سپتی بستی کا پانی پی کر اور جنگل جنگل کی خاک چھان کر ہو چکا تھا۔ لیکن سبز پری کو کالے دیو نے مینا بنا کر پنجرے میں قید کر دیا اور شہزادہ گلفام پہلے اس پنجرے کی تلاش میں سرگرداں و حیراں رہا تاکہ سبز پری کی زندگی محفوظ ہو جائے۔

کہانی کہتے کہتے بانو آپا کی نظریں ادھر ادھر بھٹک جاتی ہیں۔

چٹکی ہوئی چاندنی میں بھک سفید گھوڑے پر بھیا بنجیس پہنے ہوئے سوار ہیں۔ وہ بڑے بھلے لگ رہے ہیں ...... بھیا کا گھوڑا جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی صحت مند، تند و تیز اور شریر ہے۔ چلتا اس طرح ہے جیسے شراب پی کر جھوم رہا ہو۔ قدم بڑے متوالے ڈالتا ہے۔ ہر آواز پر کان کھڑے کر لیتا ہے۔ ہر چیز سے چمکتا ہے —— سب سے آگے ابا کی بیل گاڑی ہے اور ابا کی بیل گاڑی کے آگے پانچوں گھڑسوار اپنی اپنی تلواریں نیاموں میں لٹکائے باقاعدگی سے بڑھ رہے ہیں۔ گھوڑے ان کے بھی صحت مند ہیں۔ چلتے ہوئے بھی چوکنا چوکنا سے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن بھائی جان کا گھوڑا کچھ زیادہ ہی چاق و چوبند ہے۔

اب پو پھٹ رہی ہے۔ وہ گاؤں جہاں ہمارا خیمہ نصب ہو چکا ہوگا چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ ابا اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار

اس گاؤں کے دورے کے لیے آسکتے ہیں۔ یقیناً ان کا سواگت گاؤں کی رعایا اور ہر برآوردہ لوگ اسی اہتمام سے کریں گے جس کو ہم نے ہر نئے گاؤں میں ایک ہی انداز سے ہوتے دیکھا ہے اور پھر تاشوں جھانجھنوں اور ڈھولوں کی گت پر قنبر علی کی گھوڑی اپنا ناچ شروع کر دے گی اور تلوار نیام سے نکالے قنبر علی چاروں گھڑ سواروں کے بیچ اپنی ناچتی اور تھرکتی گھوڑی پر بہت نازاں نازاں مسکرائے گا۔ چاروں گھڑ سوار بھی اپنی تلواریں نیام سے نکالے چوکس ہو کر قنبر علی کی گھوڑی کے اطراف چلیں گے۔

غالباً بانو آپا اب یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسے میں دکھنا بھیا اپنا گھوڑا کہاں رکھتے ہیں۔ یقیناً بھیا...... گھڑ سواروں کے آگے آگے رہیں گے مگر یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ گاؤں کی رعایا ابا کے ساتھ بھیا کو بھی پھولوں کے ہار پہنائے گی۔ اس لیے کہ بھیا ابا کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ راستے پیار سے ہیں ماسٹر جی یا پڑھتے ہیں۔ پہلی بار ابا کے ساتھ دورے پر آرہے ہیں — پتہ نہیں بانو آپا اس طرح سوچ رہی ہیں یا نہیں لیکن ٹنکو میاں تو بالکل یہی سوچ رہے تھے۔ جب انھوں نے منی سے اس طرح کی بات کی تو منی تالیاں بجانے لگی۔

"تم تو بہت ٹھیک سوچتے ہو ٹنکو" منی نے کہا۔

"میں پھولوں کی بانو آپا کو بھی پھول پہنا دو" منی نے پھر اضافہ کیا۔

بانو آپا کان کی لوؤں تک سرخ سرخ ہو گئیں۔

"مجھے کیوں پھول پہناؤ گی" انھوں نے منی کے گال پر چپت لگا دی۔

بھیا یہ ساری باتیں پتہ نہیں کس ریڈیو کے ذریعہ سن رہے تھے ۔ ا
گھوڑا اکھا پھر اکر ہماری بیل گاڑی کے پیچھے لے آئے ۔
کہنے لگے " میں ساری باتیں سن چکا ہوں ۔ منی کا جواب میں دوں گا "
بھیا آگئے ہیں تو بانو آپا کی زبان ہمیشہ کی طرح گنگ ہو گئی ہے لیکن ہمیشہ
کی طرح ان کی آنکھیں بھیا سے بہت کچھ کہہ رہی ہوں گی ۔
سبھوں نے تو صرف اتنا ہی دیکھا ہے کہ بانو آپا شرما رہی ہیں ۔
پھر بھیا نے ٹنکو میاں کو اشارہ کیا ۔
وہ بیل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک دم اچھل پڑے ۔
بانو آپا چونک گئیں کہ ٹنکو میاں کو بیٹھے بٹھلائے یہ کیا ہو گیا ۔ وہ صحیح طور
ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائیں تھیں کہ ٹنکو میاں بھیا کے بازوؤں میں جھول رہے تھے ۔
پھر مزے سے بھیا کے آگے گھوڑے پر سوار مسکرا رہے تھے ۔
بھیا نے ان سے سرگوشی کی تو وہ پٹ پٹ آنکھیں مارنے لگے ۔
بھیا نے انھیں گدگدایا تو وہ سنبھل کر کہنے لگے ۔ بھیا پھول پہنیں گے تو با
آپا بھی پہنیں گی ۔ اور لگے تالیاں بجانے ۔
بانو آپا نے بھیا کو گھور کر دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں محبت سے زیادہ
تشکر کا جذبہ نمایاں نظر آیا جیسے وہ ان کے لینے استے ادپرا ٹھا لیے جانے پر
بھیا کی ممنون احسان ہوں لیکن ایسی نگاہوں سے بھیا کو بانو آپا بہت کم دیکھنے
لگی تھیں ۔ جب سے ہم لوگوں نے انھیں بانو آپا پکارنا شروع کر دیا تھا ہم
نے محسوس کیا تھا کہ انھیں بڑا اطمینان ہو گیا ہے ۔ ایسا اطمینان جو آدمی کی کھوئی

ہوئی تو قیر کے واپس ملنے پر ہوتا ہے ـــــ لیکن آج بانو آپا نے بھیا کو جن نظروں سے دیکھا جن نظروں سے وہ ان دنوں دیکھتی تھیں جب ہم انہیں صرف بانو کہا کرتے تھے۔ تو مجھے آج کی بانو آپا بڑی مختلف نظر آئیں۔ اتنی مختلف کہ ان کا اصلی روپ تو آج ہی معلوم ہوا۔

پھر بھیا نے ٹنکو میاں کو بازو سے تھام کر بیل گاڑی میں اس طرح چھوڑ دیا جیسے پانی سے بھرے جگ میں کوئی برف چھوڑ دیتا ہو اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہماری بیل گاڑی سے آگے نکل گئے۔

ٹنکو میاں نے چپکے سے ایک کاغذ کا ٹکڑا بانو آپا کے ہاتھ میں تھما دیا تو وہ خوشی اور رعونت کے ملے جلے جذبات سے کانپ سی رہی تھیں۔

کاغذ میں کیا لکھا تھا بانو آپا جانیں یا پھر بھیا۔

میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کاغذ پیار کا خط ہوگا جو بھیا کی طرف سے بانو آپا کے نام آیا تھا۔

پھر بعد میں ٹنکو میاں مستقل طور پر خدمات انجام دینے لگے ـــــ ایسا میرا اندازہ تھا۔

اب ہمارا قافلہ ایک ہرے بھرے کھیت کے پاس سے گزر رہا ہے۔ کھیت سڑک سے بالکل ملا ہوا ہے۔ چلتے چلتے بیل اچک کر ذرا جھک کر کھیت کے لہلہاتے پودوں پر منہ مارتے جاتے ہیں ـــــ ایسے میں بیل گاڑی کا اگلا حصہ ایک سمت میں جھک سا جاتا ہے ـــــ ٹنکو میاں اور ہم کافی ڈولتے ہیں اور ٹنکو میاں مسرت اور رعونت کے ملے جلے جذبات سے بانو آپا سے چمٹ جاتے ہیں۔

گاڑی بان آواز نکالتا ہے۔ بیلوں کو دھکاتا ہے، ڈراتا ہے اس پر بھی وہ نہیں مانتے ہیں تو انھیں پیٹتا ہے پچکارتا ہے اور کبھی کبھی تو انھیں کھا لینے کا موقع دے دیتا ہے۔ بے زبان جانوروں پر زیادہ جبر اس کو گوارا نہیں ہے یا پھر کھیت والے کا تھوڑا سا نقصان اپنے مفاد کے مدِ نظر اس کو گوارا ہے۔ اس کے بیل بھوکے ہیں، کھیت پر چلتے چلتے منھ مار لینے سے بیلوں کی بھوک نہیں مٹتی لیکن گاڑی بان کی تسلی ہو جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود آدمی برا نہیں ہے۔

سامان جن بیل گاڑیوں پر لدا ہے شاید اس کا گاڑی بان پچھلے سمر دنوں میں مشہور شاعر دچھا کا گیت ہی سنتے ہیں گا رہا ہے جس دھن میں شاعر خود نظم سناتا تھا

آفتاں سہتا جا، ہنستا جا، گاتا جا

بنڈی والے

یہ گیت دکن کی کھڑی بولی میں لکھا گیا ہے۔ گاڑی بان کی آواز ہمیں صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس گیت سے ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے بیلوں کے گلوں میں گھنٹیاں ٹن ٹن کر رہی ہیں۔ یہ گھنٹیاں اس وقت سے بج رہی ہیں جس وقت ہمارا قافلہ روانہ ہوا تھا۔ غیر محسوس طور پر ہم ان کی آواز بہت دیر سے سن رہے ہیں لیکن گاڑی بان کی آواز سے مل کر ان میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمیں احساس دلا رہی ہے کہ گھنٹیوں کی یہ آواز گاڑی بانوں کی تنہائیوں کی رفیق ہے۔ رستوں کی رہبر ہے گیتوں

کی سنگت ہے۔

اور یہ آواز گاڑی بان کی نہیں تھی۔ یہ تو کھیا گا رہے تھے۔ سامان کی بیل گاڑی کی اوٹ میں چھپ کر انھوں نے یہ گیت چھیڑا تھا دھن اور لے بالکل وہی تھی۔ ہم نے ان کی آواز تک نہیں پہچانی۔

اب ہم نرسے اپنے اپنے آشیانوں سے نکل رہے ہیں۔ رات کی چادر نفاست سے بیٹھے کوئی چھنگلوں میں پکڑ کر بڑی نزاکت اور احتیاط سے کھینچ رہا ہے ایک ایک شئے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی ہے۔

بانو آپا نے کہانی ادھوری چھوڑ دی ہے۔ اس ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کی نہ اس وقت ان کی خواہش ہے اور نہ ہم سب ہی اس پر مائل ہیں۔

کھیا اپنا گھوڑا پھر ہماری بیل گاڑی کے پیچھے لے آئے ہیں ـــ شاید وہ اس موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ بابا اور امی کی نظروں سے بچ کر کسی طرح وہ ہم سے چھیڑ چھاڑ کریں ـــ ہم سب انھیں پیارے ہیں ـــ لیکن ہماری بیل گاڑی میں ان کی اپنی کوئی اور شئے بھی ہے جو شاید انھیں ہم سب سے زیادہ پیاری ہے۔

آتے ہی انھوں نے ٹنکو میاں سے پوچھا۔

"ارے میاں ٹنکو"

"کہیے جی"

"بانو رانی کو ہماری چٹھی پہونچ گئی"؟

"ہاں جی"

"شاباش"

"کہو کیا مانگتے ہو" ــــ منی نے ٹنکو میاں کو کچھ آہستہ سے سکھا پڑھا دیا۔

"بانو رانی کو مانگتا ہوں جی"

بھیا بے اختیار مسکرا دیے۔ بانو آپا کے تو چھوٹا سا قہقہہ نکل پڑا جو گھنٹیوں کی طرح سریلا تھا۔

منی کہنے لگی ــــ "بھیا آخر آپ بانو آپا کو لے کر کیا کریں گے"

بھیا نے کہا۔ "دلھن بناؤں گا ــــ پھر بانو رانی کو نوکرانی کے بچے ہوں گے ــــ

"ٹنس، پیس، اوں، ٹوں ــــ دشٹ"

"یہ کیا بات ہوئی بھیا" ــــ ٹنکو میاں نے پوچھا۔

بھیا کہنے لگے ــــ "پہلا بچہ کہے گا ٹنس"

"دوسرا کہے گا ــــ پیس"

"تیسرا کہے گا ــــ ٹوں"

"چوتھا کہے گا ــــ اوں"

"اور ہم انھیں ڈرانے کے لیے کہیں گے دشٹ"

"پھر کیا ہوگا بھیا" منی پوچھ بیٹھی۔

"پھر یہ ہوگا کہ یہ سارے بچے دوڑ کر بانو رانی کی گود میں جا دبکیں گے ــــ بانو رانی بچوں سے جب یہ سنیں گی کہ ہم غصے میں ہیں تو وہ بھی ڈر جائے گی۔ اور جب ہم اس کے پاس پہونچیں گے تو وہ مارے خوف کے اس طرح سلام کرے گی"

اور بھیا کھڑے ہو کر جھک جھک کر سلام کرنے، بالکل اسی طرح جیسے بارات کے وقت دولہا میاں کرتے ہیں۔

بانو آپا دوپٹہ منہ پر رکھ کر ہنستی رہیں۔

ٹنکو میاں تالیاں بجانے لگے۔

منی شاداں و فرحاں اس طرح مطمئن ہوگئی جیسے اس کو اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہو کہ کھیا کے لیے بانو آپا کا ایک مصرف یہ بھی تو ہے۔

سامان کی پچھلی بیل گاڑی کے بیل بدک کر راستے سے ہٹ گئے تو کھیا نے جھٹ سے لگام ڈھیلی کی اور کہیں اوٹ میں ہم سے جا چھپے۔

ـــــ منزل ـــــ

رات نے بہت ساری چیزوں کو چھپا رکھا تھا تو ہم نے بھی اپنی نظروں کی حفاظت کی تھی کہ وہ رات کی تنہائیوں میں ادھر ادھر نہ بھٹکیں اور بانو آپا سے کہانی کی فرمائش کی گئی تھی اور اس طرح ذہنوں کی کھڑکیاں بند کر کے کانوں کے دریچے کھول دیے گئے تھے ـــــ رات کا بڑا حصہ اپنے گردو پیش سے بے خبر ہو کر ہم نے سبز پری اور شہزادہ گلفام کے وطن کے شاداب مرغزاروں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں گزارا تھا ـــــ لیکن اب فطرت نے آنکھوں کیلئے نظارے فراہم کر دیے ہیں تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر تیار کر لیا ہے۔ ہر شے ہمیں نہ صرف دعوتِ نظارہ دے رہی ہے بلکہ ہمیں چھیڑ رہی ہے، سلام کر رہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری عمروں کا تقاضا ہو کہ ہر شے ہمیں چھیڑتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے یا پھر سبز پری اور گلفام شہزادے کے سحر زدہ ماحول سے بازگشت اس کا سبب ہو یا پھر اس کا کوئی سبب ہو ہی نہیں ـــــ اس لیے کہ

پڑھتی ہے تو کوئی ایسی چیز جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس کا زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اور یہ تعلقِ خاطر بھی تو آدمی کو بیدار کرسکتا ہے، اکسا سکتا ہے، دکھا رسکتا ہے۔

بہرحال بانو آپا نے کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی ــــ بھیا ہمیں کبھی نظر آتے تھے، کبھی بیل گاڑیوں کی اوٹ میں یا گھڑ سواروں کی آڑ میں چھپ جاتے تھے۔ یا کبھی سامنے آجاتے بھی تو ہم انھیں دیکھ نہیں رہے تھے ــــ بانو آپا البتہ سارے جہان سے بے نیاز ہو کر صرف انھیں کو دیکھ رہی ہوں گی ــــ لیکن ان کی نظریں اب بھی جھکی ہیں، پھر بھی ان کی نیچی نظروں کا کیا ٹھکانا۔

وہ جو سامنے آموں اور ناریل کے کنجوں کا جھنڈ ہے۔ وہاں ایک باولی بھی ہے اور رہٹ چل رہا ہے۔ یہ رہٹ بہت اتنا قریب ہے کہ کبھی بیل کی گھنٹیوں کی آواز ہمیں سنائی دے رہی ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ منٹ بھر کے لیے ہی سہی اس باغیچے میں ٹھہر جائیں۔ منہ ہاتھ دھوئے جائیں۔ ناشتہ کیا جائے لیکن یہ تجویز آپا کے سامنے رکھی کس طرح جا سکتی ہے۔

ہم نے بانو آپا سے مشورہ کیا ہے، انھوں نے کچھ پس و پیش کے بعد بھیا کے ذریعہ ابا کو آمادہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن بھیا دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ہم نے آگے کے گاڑی بان سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھڑ سواروں کے ساتھ ہوں تو انھیں یہاں بھجوا دے۔ لیکن وہ وہاں نہیں ہیں۔ آموں کے اس جھنڈ کے نشیب میں ایک تالاب دکھائی دے رہا ہے۔ تالاب کے کنارے کچھ بگلے بیٹھے ہوئے ہیں۔

بڑھ رہا ہے۔

باتو آپا — ہم چیخ پڑے ہیں۔

باتو آپا کی بھی قریب قریب چیخ نکل گئی ہے۔

"کیا ہے؟ — کہتے کیوں نہیں —" ہم نے زندگی میں پہلی بار ان کے لہجے میں درستی اور تلخی کو محسوس کیا ہے — ننکو میاں اور رمی نے تو محسوس بھی نہیں کیا ہوگا۔

— "کیا ہے آخر؟" —

"وہ دیکھیے۔ وہ دیکھیے — دیکھ رہی نا آپ؟"

"کچھ بھی تو نہیں دکھائی دے رہا ہے مجھے۔ کہتے کیوں نہیں تم لوگ؟"

"وہ درخت چل رہا ہے۔ وہ دیکھیے تالاب کے اس کنارے پر — وہ — ہاں ہاں وہی — کیسا چل رہا ہے نا درخت؟"

باتو آپا ششدر رہ گئیں۔ درخت واقعی چل رہا تھا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔

ننکو میاں اچک کر باتو آپا کی گودی میں جا بیٹھے اور ٹکٹکی باندھ کر وہیں سے ٹکر ٹکر چلتے ہوئے درخت کو دیکھتے رہے۔

ہم نے گھڑ سوار شبیر علی کو بلوایا — وہ ہماری بیل گاڑی کے قریب آیا تو ہم نے اس عجوبے کے متعلق استفسار کیا۔

وہ اس انداز سے مسکرایا جیسے چٹکی بجا کر ہمارے استعجاب کو دور کر دے گا — اور واقعی یہی ہوا — اس نے ہمیں بتایا کہ یہ چلتا پھرتا درخت دراصل کوئی شکاری ہے جس نے بطخوں اور مرغابیوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے جسم کے

طرف درختوں کی شاداب ٹہنیاں اور ہرے ہرے پتے باندھ رکھے ہیں صرف سانس لینے کے لیے ناک اور دیکھنے کے لیے آنکھیں پتوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہیں۔ اس کا سر بھی پتوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ قنبر علی نے یہ بھی بتایا کہ یہ درخت آہستہ آہستہ تالاب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی تک اتر جائے گا۔ پھر وہ فیر کرے گا ـــ کوئی بطخ یا مرغابی گرے گی تو اس شکاری کا کوئی ساتھی چھلانگ لگا کر پانی میں کود پڑے گا اور بطخ کنارے پر لے آئے گا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہم نے بطخوں کو گرتے ہوئے دیکھا بھی تو تھا۔

باقو آپا سب کچھ سن رہی ہیں۔ لیکن ان کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ قنبر علی اور پتہ نہیں کیا کیا انکشافات کرتا لیکن باقو آپا پوچھتی ہیں۔

چھوٹے صاحب۔ گھوڑے پر کہیں گئے ہیں کیا؟

"ہاں بی بی ـــ وہ تالاب ہی کی طرف ابھی شکاریوں کو دیکھنے کے لیے گئے تھے ـــ کیا ابھی واپس نہیں ہوئے ـــ" قنبر علی نے پوچھا۔

"لوٹ آتے تو نظر نہ آتے؟" ـــ باقو آپا کے لہجے میں اب بھی وہ نرمی نہیں تھی جو ان کی گفتگو کا خاصہ ہے۔

قنبر علی پھر کہنے لگا ـــ "گاؤں اب یہاں سے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ رہ گیا ہے۔ نشیب میں ہونے کی وجہ سے گھر دکھائی نہیں دے رہے ہیں ـــ میں صاحب کی آمد کی اطلاع کر آیا ہوں۔ لوگ سواگت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ باجے اور پھولوں کے ہار لے کر آ رہے ہیں ـــ وہ چھوٹے صاحب کی بھی گلپوشی کرنا چاہتے ہیں۔"

ٹنکو میاں اور بھی تالیاں بجانے لگے۔

ہا ہا ہا — ہمیں پھولوں میں سنائی ہے — وہ بار بار ٹنکو میاں سے کہہ رہی ہے۔ تم بڑے سیانے ہو گئے ٹنکو — تم تو پہلے بھی سے کہہ رہے تھے۔

بانو آپا کا چہرہ باغ و بہار ہو رہا ہے۔ ان کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمک رہی ہیں — ان کے عارض پر گلاب کھل گئے ہیں۔

"میں ذرا چھوٹے صاحب کو اس بات کی اطلاع کر دوں" — قمبر علی نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور ہوا سے باتیں کرتا باغیچے کی سمت روانہ ہو گیا۔

شاداب کھیتوں کے درمیان سے ہو کر اس کی گھوڑی پگڈنڈی پر اس قدر تیزی سے جا رہی تھی جیسے میدان میں دوڑ رہی ہو۔

چلتا پھرتا درخت تالاب کے پانی میں واقعی اتر گیا ہے۔ اب وہ بالکل خاموش کھڑا ہے۔ ہماری بیل گاڑیاں سیدھی جانب گھومتی ہوئی ذرا فراز پر آ گئی ہیں۔ یہاں سے منظر زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

چلتا پھرتا درخت جو اب ساکن کھڑا ہوا ہے اس کی بائیں جانب ایک ٹہنی پھوٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ٹہنی درخت کے اوپری سرے تک پہنچ گئی ہے — بلاشبہ یہ بندوق ہے جس کو شکاری نے پتوں میں چھپا لیا ہے — ہمیں صرف دھماکہ سنائی دیا ہے اور چلتے پھرتے درخت کے بالکل مقابل ایک آدمی چھلانگ لگا کر تالاب میں بڑی بے جگری سے پانی کاٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

قمبر علی کی گھوڑی ذرا سا نشیب میں ہمیں دکھائی دے رہی ہے — لو

وہ تو واپس لوٹ رہا ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر اپنی گھوڑی کو اس طرح سرپٹ دوڑاتا ہوا یہ نوجوان کھیت سے پھلتے کھیتوں میں کیسا پھلانگ رہا ہے۔

دیکھتے کے دیکھتے وہ ہمارے قافلے کے قریب پہونچ گیا۔

ٹھہرو۔ اس نے قریب تر پہنچ کر کہا۔

"چھوٹے صاحب کے سینے میں درد ہے وہ بے ہوش ہو گئے ہیں"

پلک جھپکتے میں سب گھوڑ سوار قمیز ہی کے پیچھے اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے کھیتوں میں گزر رہے ہیں۔ ایک گھوڑے پر ابا بھی سوار ہیں۔

ہم لوگ سب کے سب پیدل ٹالٹر لیوں سے کود پڑے ہیں اور نشیب میں اسی سمت بھاگ رہے ہیں جس طرف گھڑ سوار گئے ہیں ——— بانو آپا امی کا ہاتھ تھامے سب سے آگے آگے ہیں۔

باجوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ شاید گاؤں کے لوگ ہمارے سواگت کو آرہے ہیں۔

پھر میں جیسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ——— کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے لیکن کوئی کہہ رہا ہے کسی کا حرکت قلب بند ہونے سے ——— شاید یہ ابا کی آواز ہے جو بمشکل ان کے رندھے ہوئے گلے سے نکل سکی ہے۔

ایک اور آواز اس آواز کے ساتھ کہیں دور سے آرہی ہے۔

بانو میری ——— بانو میری۔

ننکو میاں سے کوئی کہہ رہا ہے کہ بھیا چاند میں گئے ہیں۔

بانو آپا سوچ رہی ہیں چاند تک پہونچنے والا آدمی، آدمی کے دل تک کب پہونچے گا، اس کی زندگی تک کب پہونچے گا۔

میرے ذہن میں بھی مستقبل کا کچھ عجیب دھندلا سا خاکہ ابھر رہا ہے۔

یہ کہانی ہے۔ کوئی حقیقت تو ہے نہیں —— پھر کسی کہانی کو اس طرح غیر متوقع طور پر ختم نہیں ہو جانا چاہیے ——

لیکن میں کیا کروں بھیا مر گئے ہیں۔

پانی کے چراغ

چھم چھم کرتی انورجہاں کو دیکھ آئے تو جیسے نیندوں کے خزانے کی گٹھڑی بنا کر چپکے سے اس کی نذر کر دیا۔ اس طرح کہ خود اسے بھی خبر نہ ہوئی کہ کسی نے اپنا سب کچھ تج دیا ہے لیکن طرحدار علی خاں کے لیے پھر کوئی شب ایسی نہ ہوئی جس کی سحر کرنے میں آنکھوں نے موتی نہ لٹائے ہوں۔ سب نے دیکھا کہ بوجھل پپوٹوں کے نیچے کچھ سرخیاں اس طرح چھپ کر طرحدار علی خاں کی آنکھوں میں رچ بس گئی ہیں کہ جیسے دنیا بھر میں کہیں اور انھیں جگہ ہی نہ تھی۔

اتنی بڑی چھوٹی تو تھیں نہیں کہ چھم چھم کرتی دیکھا اور بڑھ کر گود میں اٹھا لیا اور چپکے سے خلوت کدے کی زینت بنا لی ــــــ شہر کے راجے آنکھیں بچھا رہے تھے۔ نواب زادوں کی ڈولیاں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں جے پور سے تین بہنیں حیدرآباد

پھونکیں اور جیسے سارے شہر میں غل غپاڑہ مچ گیا۔ غدر ہوگیا۔

نواب جگو میاں کی نواب کی میاں سے بڑی جون کے لیے ایسی ان بن ہوئی کہ بھری انجمن میں تلواریں کھنچ گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ تلواریں چلیں نہیں اس لیے کہ دونوں ہی صرف تلواریں کھینچنا جانتے تھے۔ چلانے کے لیے پہرے داروں کی کمی نہ تھی جو یہ معمولی کام بھی وہی کر دیتے۔ چلو اچھا ہی ہوا نا۔ ورنہ کیا خون خرابے ہوتے۔ بچپن چپکے سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوا تو نیموں کے پان اور ابردوں کی کٹاریں اس بری طرح گھائل کیا کہ سب کی تلواریں اپنی نیام میں ہی دھری دھری زنگ آلود ہوگئیں۔

لیکن طرحدار علی خاں نے پہلی بار بھری انجمن میں پلکیں جھپکائیں تو اتنی چکا چوند تھی کہ انجمن سے اٹھتے اٹھتے تک انہیں سارا دنیا تاریک تاریک سی ویرا ویران سی دکھائی دینے لگی۔ دل کی بستی میں جیسے جراحتوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ نشتروں نے طنابیں کھینچ لی تھیں چپکے چپکے سلگتے رہنا اور اف نہ کرنا ــــ کبھی دبی آنچ نہ شعلہ بن کر لپکی نہ راکھ کا ڈھیر بن کر ٹھنڈی ہوئی۔

کوئی محفل ہو کوئی انجمن ہو دو آنکھیں چھم چھم کرتی انور جہاں کو تکے جاتیں۔ متقل مدخواست ہوتی تو گزرنے والے کے دل پر سب کچھ گزر جاتی لیکن انور جہاں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی اس بھری پُرتنا دنیا میں ان کی بدولت تنہا تنہا ہو کر رہ گیا ہے"

پھر طرحدار علی خاں کی آنکھوں میں ان کے اپنے آنسو رات رات بھر دو کنکر بن کر کھٹکتے رہے" اور بستر بستر خار بستر ہو کر رہ گیا۔

مقابل آ گیا ۔۔۔ دیکھیں کہ ہے کوئی عاشق مزاج جو اس طرح چھیڑ چھاڑ کرتا ہے ۔ لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا ۔ دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا مرد نور جہاں کے آگے دوزانو ہو گیا ۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے قدم پکڑ لیے اور سر جھکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ نور جہاں حیرت کے لیے تیار تھیں ۔ انھیں مرد کی باہوں سے تڑپ کر نکل جانا تو آتا تھا ۔ وہ یہ تو جانتی تھیں کہ طاقت ور سے طاقت ور مرد کو شائستگی کا مظاہرہ کر کے کس بے دردی سے دو ہاتھ جھٹکا دے سکتی ہیں کہ پھر کسی حرکت کی جرأت ہی نہ ہو ۔ لیکن اس حملے سے کس طرح بچ نکلنا چاہیے نور جہاں نے کبھی نہ سوچا تھا ۔ نہ کسی نے سکھایا ہی تھا ۔ طرحدار علی خاں کے آنسو تھے کہ ان کے قدموں کو بھگوئے دیتے تھے اور جہاں پر جیسے سکتے کا عالم طاری تھا ۔ وہ نہ کچھ پوچھ سکتی تھیں نہ جھک کر طرحدار علی خاں کو اپنے قدموں سے اٹھا سکتی تھیں ۔ بوکھلاہٹ میں آخر کار انھوں نے جھک کر اٹھانا چاہا تو ہاتھوں کا سہارا پا کر طرحدار علی خاں نے نور جہاں کے ہاتھ تھام لیے اور ان کو آنکھوں سے مل کر آنسوؤں سے تر کر دیا ۔

بہ دقت تمام نور جہاں نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اس قدر دل گیر کیوں ہیں ۔ طرحدار علی خاں جو اتنا کہہ سکے کہ مجھے میری زندگی دے دو جو بطور نذر ہی نہیں میں نے تمہارے قدموں میں ڈال دی ہے ۔ ورنہ میں مر جاؤں گا ، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔

نور جہاں کے ذہن میں مرنے والوں کی بڑی لمبی چوڑی سی فہرست محفوظ تھی ۔ لیکن پتہ نہیں انھوں نے طرحدار علی خاں کا نام اس فہرست میں کیوں شامل

نہیں کیا ۔ کہنے لگیں، آپ میرے گھر تشریف لائیں، مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی
اور ایک جھپاکے سے حجرے کو پار کرکے باہر نکل گئیں۔

اندھیرے میں انھوں نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہ تھا کہ یہ کون نوجوان ہے جو
اس طرح گڑگڑا رہا ہے بھی تک پہونچ کر انھوں نے گھوم کر دیکھا تو طرحدار علی خاں
بھی اس طرح تک رہے تھے جیسے بچہ کھلونوں کو تکتا ہے اور واقعی طرحدار علی
خاں بچے بھی طرحدار۔

انور جہاں کو کوئی محرومی نہیں ہوئی اور بھی ترت ترت کرتے آگے بڑھ گئیں۔

طرحدار علی خاں ایک نہیں ہزار بار انور جہاں کے گھر گئے۔ پاؤں سے نہیں
سر سے چل کر۔ اور پھر ایک بار ایسے گئے کہ بس ادھر ہی کے ہو رہے۔ وہ چلتی
پھرتیں تو آپ آنکھیں بچھاتے۔ وہ بیٹھی گلوریاں بناتی رہتیں تو آپ سو سو طرح نثار
ہوتے رہتے۔ وہ سو جاتیں تو بس بیٹھے چپ چاپ تکا کرتے۔ پھر یکایک پیروں
پر آنکھیں ملنے لگتے۔ وہ پیر سمیٹ لیتیں، تو خوش ہو کر آغوش میں لے لیتے۔

پھر چپکے چپکے نکاح کے دو بولوں کے بدلے میں انور جہاں بالکلیہ طرحدار علی خاں
کی جانم بن گئیں۔ وہ انھیں اب جانم کہہ کر پکارتے۔ انور جہاں کچھ اس طرح طرحدار
علی خاں سے وابستہ ہوئیں کہ دیکھنے والے بلا کسی لاگ لپیٹ کے کہہ اٹھتے کہ انور جہاں
بنی ہی اس واسطے تھیں کہ کسی ایک کی ہو کر رہیں، کسی ایک دل میں سکون اور اطمینان
سے بس اس طرح براجیں کہ انھیں دنیا کی کچھ خبر ہی نہ ہو ــــــ اور ہوا بھی یہی ــــ
وہ طرحدار علی خاں میں کھو گئیں اور طرحدار علی خاں ان میں کھو گئے۔

لیکن ہم سے پہلے ہی بہت سے لوگ لکھ گئے ہیں کہ محبت اس دنیا میں پروان

نہیں پڑھ سکتی۔ چنانچہ انور جہاں کے چھوٹے سے کنبے میں وہ ادھم مچا کہ وہ ہنگامے ہوئے وہ وہ فتنے کھڑے ہوئے کہ الحفیظ والامان۔

بات کچھ اتنی غیر اہم بھی تو نہ تھی جو بالکل ہی نظر انداز کر دی جاتی! اپنا وطن چھوڑ کر گھر بار پھونک کر جے پور سے حیدر آباد کو اس کنبے نے ہجرت کی تھی ـــــ کیا کیا سوچا تھا کہ زندگی کی بہاریں اپنی ہی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک نہیں دو نہیں۔ تین بہنیں تھیں۔ پھر تینوں بھی ایسی کہ ایک بر دوسرے کو ترجیح دینا بجائے خود بار ایک بینی کے فن کا کمال تھا۔ اب گھر والے اگر اس طرح سوچیں کہ جے پور سے حسن کی ساری دولت سمیٹ کر ان کا قافلہ سوداگری کرنے حیدر آباد جیسے متمول شہر میں آن بسا تھا کہ ایک دولت کا دوسری دولت سے تبادلہ ہی تو ہوگا۔ لیکن یہاں آکر اپنی پونجی جیسے کنگالوں کے ہاتھوں لٹ گئی ـــــ کچھ باقی رہ گئی تھی سو اس کا بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ پتہ نہیں کب کون کس کے گھر بیٹھ جائے۔ یوں گھر بیٹھنا ہی اگر زندگی کا مقصد تھا تو کون اپنا پیٹ کاٹ کر تان سر کے فن پر سب کچھ نچھاور کرتا۔ بھئی آس تو یہی تھی کہ تینوں کی تینوں ہندوستان بھر میں نام پیدا کریں گی۔ اللہ میاں نے صورت دی تھی، گلا دیا تھا۔ بائی جی نے اپنا سارا اثاثہ پھونک کر کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ سارے کا سارا فن جیسے گھول کر تینوں بہنوں کو اپنے ہاتھ سے بائی جی نے اس طرح پلا دیا تھا کہ ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ اور حیدر آباد پہونچ کر ابھی پر پرزے نکالے بھی نہ تھے کہ انور جہاں، طرحدار علی خاں کی ہو کر رہ گئیں، بائی جی کو زمانے پرکھا تھا، برتا تھا، بالکل اس طرح جس طرح بائی جی نے خود زمانے کو

پر کھا تھا اور برتا تھا ـــــ طرحدار علی خاں کے عشق کا ناٹک ظاہر ہے انہیں ایک آنکھ نہ بھایا ـــــ صاحبزادے لٹو ہو گئے تھے تو کوئی مضائقہ نہ تھا ـــــ گھر پھونک کر دنیا میں نام کرتے اور اس طرح تو بائی جی کی بن آتی۔ لیکن یہاں تو لیل و نہار ہی دوسرے تھے، شام و سحر ہی بے ڈھب تھے۔ نہ ہینگ لگی تھی نہ پھٹکری اور طرحدار علی خاں کے عشق کا جادو تھا کہ انورجہاں کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

کدھر منہ مری، مٹی کی گڑیا جیسی لڑکی اب گز گز بھر کی زبان نکال کر دو ٹوک باتیں کرتی۔ دنیا بھر کی مسجدوں کے ملاّ نے مر گئے تھے اور سبھوں نے ویران مسجدوں کی جانمازیں سمیٹ کر انورجہاں کے حوالے کی تھیں جو وہ بات بے بات کے مصلےّ بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چھت کو تکتیں، پھر ٹپ ٹپ دو چار آنسو گرتے ہوئے ٹوٹتے تاروں کی مانند سارے جگ کی آنکھوں کو دکھائی دیتے۔ رہ گئیں دعائیں، ان کے قبول ہونے نہ ہونے کی بات تو سانچا بادشاہ ہی جانے۔

بائی جی نے سو سو طرح سے فتنے اٹھائے، ہنگامے کھڑے کیے۔ کوئی تدبیر نہ چھوڑی کہ انورجہاں، طرحدار علی خاں کے چنگل سے نکل سکے۔ لیکن خدا معلوم ان تھوڑے سے دنوں کی یکجائی میں طرحدار علی خاں نے کیا کیا سبق پڑھایا تھا کہ انورجہاں صاف صاف کہہ اٹھتیں کہ میں باز آئی اس زندگی سے جس کا راستہ سیدھے جہنم کو جاتا ہے۔

اور بائی جی جیسے انورجہاں کو سیدھے جہنم کو لے جانے پر تلی بیٹھی تھیں۔

وہ بڑی گراوٹ پہ اتر آئی تھیں کہنے لگیں پہلی بار حسن خصم کی آغوش گرمائی تھی وہ تو نہ ہوا سب کچھ تیرا۔ کہتی تھی میں کسی پنجرے کا پنچھی نہیں ہوں جو اپنے پنکھ کاٹ کر بیٹھ رہوں۔ میری کلا، میرا فن کیا سب کچھ ان کے ساتھ ہی بیٹھ رہے گا۔ اور اب اس باؤلے لونڈے کے پیچھے اس طرح دیوانی ہوئی ہے کہ بات شروع ہو تو سانچے بادشاہ کی دہائی سے اور بات ختم ہو تو سانچے بادشاہ کی دہائی پر۔ اور وہ بھی مت مارا، مجنوں کی اولاد، دروازہ بند کر لیتے ہیں تو رات رات بھر چوکھٹ پر بیٹھا گزار دیتا ہے۔

یکایک انور جہاں شیرنی بن کر بپھر گئی۔ سب کے سب حیران سے ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے۔ قدم پکڑ کر سسکنے والی لونڈیا، آن کی آن میں زخمی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔

کہہ رہی تھی۔ بوٹیاں نچوا دو ہماری۔ مرد اگر کسی کھڈ میں پھینکوا دو — وہ تو اس کی شرافت ہے جو دروازہ بند کر لینے پر بھی رات رات بھر چپ چاپ چوکھٹ پکڑ کر گزار دیتا ہے۔ سن رکھو وہ میرا کوئی ہوتا سوتا نہیں ہے۔ وہ میرا شوہر ہے۔ میں نے عقد کیا ہے اس سے وہ جس وقت چاہے میرا ہاتھ تھام کر اس چار دیواری سے مجھے نکال سکتا ہے، جہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

طرحدار علی خاں کو جانم کا اس ماحول میں سانس لینا ایک لمحہ نہ بھاتا تھا۔ وہ تو صرف اپنی جانم کی خاطر کہ کبھی وہ بائی جی کو راضی کر لیں گی تو ہنسی خوشی وداع ہوں گے۔ اس نیک ساعت کے منتظر تھے جب کہ جانم ان کے

چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو جائیں گی جو انھوں نے اپنے ماں باپ کی چوری چھپے کرائے پر لے رکھا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ بائی گھاٹ کا پتھر تھیں۔ طوفانوں نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن وہ نہ ہلیں۔

طوفانوں نے خود ہی اپنا رخ بدل لیا۔ اور اس طرح رات کے اندھیرے میں انور جہاں ہمیشہ کے لیے طرحدار علی خاں کی ہو گئی تھیں۔

اپنی دولت جب اس طرح شہر میں بر سرِ عام لٹنے لگی تو بائی جی کے لیے اپنے بچے ہوئے اثاثے کے لالے پڑ گئے۔

یہاں کے نواب زادوں کے کچھن بائی جی کو دنیا بھر سے کچھ مختلف ہی نظر آئے۔ جن کے پاس دولت ہوتی وہ بے دریغ لٹاتے بھی۔ لیکن ایسے تھے کتنے یہی جنھیں انگلیوں پر گن لیا جا سکے۔ دوسرے تھے تو عشق جیسے انھیں ورثے میں ملا تھا۔ کیوپڈ کا دیوتا جیسے ان کے خانۂ دل کا پاسبان تھا ایسا شاید عشق کرتے کہ مجنوں بے چارہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید اس کا سارا کیا کرایا مٹی میں مل جاتا۔ استنے دن کی شہرت، عزت و ناموس دیکھتے دیکھتے جہنم داخل ہو جاتی۔

انور جہاں جب اتنی آسانی سے طرحدار علی خاں کی ہو رہیں تو دنیا کی ساری محبتوں پر سے بائی جی کا ایمان اٹھ گیا۔ وہ جس کو سینے سے لگا کر سلایا، وہ جس کو چھاتیاں چوا کر دودھ پلایا۔ وہ جس کے لیے زندگی کا سکھ چین لٹا دیا۔ وہ جس کی آنکھ نہ جھپکی تو اپنی راتیں تصدق کر دیں۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو——

اور یادوں کا ایک سلسلہ ان کے ذہن سے گزر کر ان کی آنکھوں کے آگے مجسم

ہوتا ہوا بس آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھل گیا۔

یہ آنسو بائی جی تمھارا مقدر بن سکتے ہیں۔ یہ آنسو بائی جی تمھارا مقدر بن سکتے ہیں۔ کوئی تھا جو مسلسل بائی جی کے کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر چلا رہا تھا ــــ یہ آنسو بائی جی تمھارا ــــ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

اپنی بچی کھچی دولت لے کر لوٹ جانا چاہیے ــــ اپنی دونوں بیٹیوں کو لیکر واپس ہو جانا چاہیے۔ کوئی ہتھوڑے سے ذہن پر چلا رہا تھا اور بائی جی نے طے کر لیا کہ کئی دن سے یہ جو آرے سے دل پر چل رہے ہیں۔ انھیں اپنی گرفت میں مضبوطی سے تھام کر بیچ سڑک پر اس طرح پھینکے گی کہ اس شہر کی ہر ماں کا دل گھائل ہو جائے۔

چھوٹی بٹیا کو راجہ صاحب نے آج پھر مجرے کے لیے بلایا تھا۔ بائی جی سُن چکی تھیں کہ وہ چھوٹی بٹیا کے بغیر پل بھر چین سے نہیں گزار سکتے تھے۔ مجرے کا بیعانہ لوٹاتے ہوئے بائی جی نے کہا ــــ داروغہ جی راجہ صاحب سے کہہ دینا۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل ــــ وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بڑھ کر داروغہ جی کو آواز دی۔ ”کہہ دینا میں آ رہی ہوں“۔

بائی جی نے چھوٹی بٹیا کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں ــــ بٹیا تمھارے دل کے کسی کونے میں کہیں تمھاری ماں بھی تو رہتی ہوگی؟ ـ اسے ڈھونڈھ نکالو، اسے ڈھونڈھ نکالو۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بائی جی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔

چھوٹی بٹیا جانے کی تیاری کرنے لگی تو ــــ بائی جی نے سوچا ــــ
دھڑا دھڑ اپنا گھر جلتا رہے تو قہقہہ لگانے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔
لیکن اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس سکتیں کسی نے ان کے قدم پکڑ لیے۔
بائی جی جلتے ہوئے گھر کا سماں آنکھوں میں لیے خیالوں ہی خیالوں میں
کہیں دور جا چکی تھیں۔ پتہ تک نہ چلا کہ کون در آیا اور کس نے قدم تھام لیے۔
انور جہاں کی سرکشی کے خلاف بائی جی نے اپنے ترکش کا کوئی تیر اٹھا
نہ رکھا تھا جو سرزنش نہ کر سکے۔
لیکن جب ہار ہوئی ہے تو بائی جی جیسے اس طرح لٹے لٹا گئیں کہ غصہ
کرنے کی جرأت بھی ان سے کسی نے چھین لی۔ اور اب بٹیا پر پُر نے نکالنے
لگی تھی تو بائی جی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قینچی لے کر بال و پر کتر دیتیں۔
اب تو کوئی انہیں کی غمخواری کرے تو کرے۔ کوئی انہیں پر ترس کھائے تو کھائے۔
بائی جی نے تڑپ کر جو گردن جھکائی تو انور جہاں قدموں میں سسک رہی تھی۔
"ماں۔ میں آگئی ہوں۔"
"ہاں۔ میں آگئی ہوں۔"
بائی جی دیوانوں کی طرح انور جہاں کو تکتی رہیں۔ بدقت انھوں نے پوچھا۔
"طرحدار میاں کہاں ہیں انور؟"
"میں کچھ نہیں جانتی ماں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں ان کا انتظار کرتی
رہی۔ میں ان کا انتظار زندگی بھر کر سکتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ
وہ لٹے ہوئے جاگیردار ہیں۔ وہ چاہے کچھ ہوں ماں، میرے پیٹ میں میرے

پلیٹ میں۔ اور انھیں اس سے بھی تو محبت نہ ہوسکی۔ جو ان کا بھی۔۔۔ جو ان کا بھی خون ہے۔

بائی جی نے انور کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اس شہر سے چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن میری جیت ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی چیز سچی نہیں ہے۔ صرف آنسو سچے ہیں۔ وہ چراغ نہیں بجھتے جو بھیگی ہوئی آنکھوں میں جلتے ہیں۔۔۔ اور طرحدار میاں کے انھیں چراغوں نے تیری زندگی میں روشنی ہی روشنی بھری تھی۔ ایسی روشنی جس کے آگے میرے گناہ کانپ کانپ جاتے تھے لیکن وہ سارے چراغ بجھ گئے ہیں۔"

انو نے نظر اٹھائی تو اسے کھونٹی پر اپنی جانماز اور تسبیح نظر آئی جن کا طرحدار میاں کی ہو رہنے کے بعد اس نے سہارا لیا تھا۔

اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ماں جھاڑ پونچھ کر انھیں کسی مسجد میں بھجوا دو۔

اور بڑے انداز سے بڑھ کر اس نے فرش پر پڑے ہوئے پائل اٹھا لیے۔

ساحی

میں نے جب ان کا خط کھولا تو گلاب کی پنکھڑیاں میرے قدموں میں بکھر گئیں۔
اور یہ پنکھڑیاں ساحرہ نے چن لیں۔
میرا کتنا جی چاہا کہ جھک کر ایک ایک پنکھڑی چن لوں — لیکن یہ مجھ سے نہ ہوا۔
شرم دامن گیر تھی۔ میں نے ان کا خط بھی تو نہیں پڑھا بس القاب پہ نظر ڈال کر
یہی سرخ ہو اٹھی اور اپنے بلوز میں اڑس کر پلو برابر کر لیا۔
پنکھڑیاں چن کر ساحرہ نے مجھے دی نہیں بلکہ نہایت ہی احتیاط سے انھیں
پلو میں باندھ لیا — مجھے یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی — میں تو سمجھی ہوئی تھی کہ
وہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دے گی اور میں مٹھی میں دنیا بھر کی نظروں سے ان
پنکھڑیوں کو چھپا لوں گی یہاں تک کہ ساحرہ کی نظروں سے بھی۔

قدوائی کالج کے کنج کنج میں لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے میں نے موتیوں کی مثال اس لیے دی ہے کہ سب کے سب سفید لباس میں ملبوس تھے۔ اور اس لیے بھی کہ ہم گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جو بلندی سے دو شاخوں میں بیضوی شکل میں بدل گئی ہیں، اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں۔ ہم سبھوں نے موٹروں سے اترتے ہی انھیں سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے سب کے پیچھے رہ گئی اور بلندیوں پر کھڑے اس خوبصورت سے اجلے اجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا جو ان بیضوی سیڑھیوں پر موتی کی مالا بن گیا تھا۔ اور یہ مالا نشیب میں پہونچ کر ٹوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے۔۔۔ علیم نے مڑ مڑ کر کئی بار مجھے دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن میں ان کی نظروں سے چھپ کر انھیں دیکھ رہی تھی۔

وہ آنکھیں بھری پوری محفل میں کسی کو تلاش کر رہی ہوں، مضطرب، بے قرار، بے کل لیکن چھپے چوری۔۔۔ اور وہ دو آنکھیں جن کی تلاش ہو رہی ہے۔ چمن کے کسی محفوظ گوشے میں پھولوں کے بیچ چھپ کر ان پیاسی آنکھوں کی بے قراری کا منظر دیکھ رہی ہوں جو متلاشی ہیں۔۔۔ تو دل دنیا بھر کی کتنی ہی دولتیں پا لیتا ہے۔

اور میں انھی دولتوں سے مالا مال تھی۔۔۔

علیم کی نظروں سے چھپ کر علیم کو دیکھتے رہنے میں میرے لیے کیا کچھ نہ تھا میری اپنی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک بھی تھی۔ علیم کی غزالی آنکھوں کی بے قراری کا سماں بھی تھا۔

اور علیم نے میری اسی آنکھ مچولی سے تنگ آکر مجھے یہ خط لکھا تھا جو اس نے ساحرہ کے ہاتھ مجھے بھجوایا تھا۔

اور میں کسی محفوظ کنج کی تلاش میں گھوم رہی تھی تاکہ سب کی نظروں سے چھپ کر علیم کے خط کے لفظوں کو اپنی آنکھوں میں اتار لوں۔

مجھے پھر بکھری ہوئی پنکھڑیوں کا خیال آیا جو ساحرہ نے چن لی تھیں۔

اور میں پھولوں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑی جہاں رنگ برنگے پھول مسکرا رہے تھے ـــــ پھولوں کے جھنڈ کی اس اوٹ نے مجھے پناہ دی میں نے خط کھولا۔ علیم نے لکھا تھا۔

روحی ..... میری زندگی

میں نے چمن میں قدم رکھتے ہی تمھارے لیے یہ پھول کسی کومل سی ایک شاخ سے جدا کر لیا تھا کہ اسے تمھاری زلفوں کی لمبی سیاہ رات کا چمک دار ستارہ بنا دوں۔ لیکن تم تک میری رسائی کہاں جب کہ تم خود مجھ سے چھپتی رہتی ہو۔

اس پھول کے مقدر میں تو پنکھڑی پنکھڑی ہو جانا تھا۔ سو میں نے بے دردی سے اسے نوچ دیا ہے ـــــ اب تم اتنا ہی کرو کہ ان پنکھڑیوں کو بکھرنے نہ دو۔"

تمھارا علیم

اور پنکھڑیاں نہ صرف یہ کہ بکھر چکی تھیں بلکہ ساحرہ کے ہاتھوں نے انھیں میرے قدموں میں سے چن لیا تھا ـــــ میں تڑپ کر رہ گئی ـــــ میں نے خط پڑھا ـــــ اور میری

زلفوں کی لمبی سیاہ رات بغیر کسی تارے کے ویران سی رہ گئی۔

جب میں پھولوں کے جھنڈ سے نکل کر سب میں آملی تو۔ علیم نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں پیار کر رہے ہوں۔ تاش کھیلتے ہوئے ان کی نظریں تاش پر نہیں تھیں۔

لیکن اب میرے دل و دماغ پر علیم نہیں ساحرہ چھا چکی تھی میری نظریں اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

یکایک وہ مجھے نظر آئی ـــ علیم ہی کے پیچھے بیٹھی ہوئی انھیں کارڈس ٹرس کارڈ کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

ساحرہ علیم سے کس درجہ گھل مل گئی ہے ـــ وہ تو میرے اور علیم کے درمیان ایک ایسا ربط باہمی تھی جو زنجیر کی ایک کڑی کو دوسری سے ملاتی ہے۔ لیکن جب یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی کڑیاں انھیں جوڑوں میں سے جدا ہو جاتی ہیں۔ جو ان کے ملاپ کا وسیلہ تھیں۔

میں صرف اتنی سی بات پر ساحرہ کی مخالفت میں اتنا بہت کچھ کیوں سوچ رہی تھی۔

شاید میرے اندر چھپی ہوئی وہ عورت بیدار ہو رہی ہو جو زندگی کا داؤ لگا کر بھی اپنی محبت کی ایک ایک کرن کا حساب جاننا چاہتی ہو اور علیم تو خاندان بھر میں چمکتی ہوئی دھوپ تھے ـــ سب کے چہیتے۔ لیکن یہ سورج تو میرا ہی تھا نا ـــ بلا شرکت غیرے میرا۔ میں کچھ ایسا ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

پتہ پھینکو بھی ـــ ساحرہ کی آواز نے مجھے اور علیم کو بیک وقت چونکایا۔

اور علیم نے جھٹ سے پتہ پھینکنا چاہا تو ساحرہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
"کیا کر رہے ہو ۔۔۔ تمھیں ڈھنگ کا پتہ پھینکنا بھی نہیں آتا ۔۔۔" علیم کے ہاتھ میں ادھ کھلے گول پنکھے کی طرح سجے ہوئے کارڈس میں سے جو پتہ آگے نکل آیا تھا۔ اس کو ساحرہ نے پھر سے برابر کر دیا ۔۔۔ اور بڑے ہی تحکمانہ انداز سے کہا ۔۔۔ یہ پتہ پھینک دو۔

اور علیم نے چپکے سے وہی پتہ پھینک دیا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ساحرہ نے مجھے ڈس کارڈ کر دیا ہے۔

اور اس کے بعد علیم نے میری طرف کم دیکھا اور میں اپنی یہ توہین گوارا نہ کر سکی۔ اور چپکے سے اٹھ کر تاش کی اس محفل سے چلی آئی ۔۔۔ اس وقت شاید میں علیم کے ذہن سے اس طرح محو ہو گئی تھی۔ جیسے ڈس کارڈ کیا ہوا پتہ کھلاڑی کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

میں جب اٹھ کر جانے لگی تو ساحرہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہہ جانا ان کے بس میں نہ ہو۔

میں کسی گوشے میں چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی ۔۔۔ لیکن گوشے میں پہونچ کر بھی میرے آنسو نہ نکلے۔

وہ ہارٹ کی بیگم۔ علیم نے ڈس کارڈ کی ہے ۔۔۔ وہ تو تم ۔۔۔ وہ تو تم ہو ۔۔۔ وہ تم ہو۔

"میں نہیں ہوں ۔۔۔ میں نہیں ہو ۔۔۔ میں نہیں ہوں ۔۔۔" میری زبان سے بہت آہستہ سے یہ الفاظ نکلے۔

اور دو آنسو میرے گالوں تک ڈھلک آئے۔

"یہ کیا ہے ــــ بگلی ــــ" میں نے اپنی آنکھوں پر نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

یہ ہاتھ ساحرہ کے تھے ــــ میں تڑپ کر رہ گئی۔

"خدارا مجھے تنہا چھوڑ دو ساحی"

"لیکن تم وہاں سے اس طرح اٹھ کر کیوں چلی آئیں"

"تمھیں اس سے کیا مطلب"

"بہت ہو چکی بکواس۔ چلو میرے ساتھ ــــ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔"

ساحرہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ پھر کہنے لگی۔ "تمھیں پتہ ہے ساری نظریں تم دونوں ہی کو تاک رہی ہیں ــــ تم لوگ اس طرح ہوش کیوں کھو دیتے ہو اپنے ــــ قریب آتے ہو تو سلیقے سے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر پاتے ــــ سٹی گم ہو جاتی ہے بس ــــ ایسے جیسے محبت نہیں کر رہے ہو ــــ زندگی سے ڈر رہے ہو ــــ جذبے اور احساس سے ڈر رہے ہو"

میں پیسے ہوش میں آنے لگی۔ میرے اور علیم کے دل و دماغ اور نطق و لب کی ذمے داریاں کھلی جب ہماری سوئی جاگتی آنکھوں پر پردے ڈالتی پھرتی ہے ــــ لیکن اس پردہ داری سے اسے کیا مل جاتا ہے؟!۔

اس کے اصرار پر میں پھر سب لوگوں میں آ گئی۔

اش کی محفل جو برخواست کر دینے میں علیم پیش پیش تھے طے یہ ہوا کہ آنکھ مچولی

کھیلی جائے لیکن ہم لڑکیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔
علیم نے مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کی کہ میں راضی ہو جاؤں اور میں نے نہ صرف آمادگی ظاہر کر دی بلکہ دوسری سہیلیوں کو بھی ہموار کر لیا۔
کھیل شروع ہوا تو میں اس پھولوں کے جھنڈ کی طرف بھاگی جو مستقل طور پر میری جائے پناہ تھی۔ میں نے جھنڈ کے پیچھے خود کو چھپا لیا اور خرگوش کی طرح دبک گئی۔ ساری لڑکیاں اور لڑکے قدوائی کالج کے کنج کنج میں چھپتے پھر رہے تھے مجھے شک گزرا کہ اس لڑکی نے مجھے پھولوں کے جھنڈ میں چھپتا ہوا دیکھ لیا ہے جو چور بنی تھی۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھی کہ یہاں سے کہیں اور جا چھپوں کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا ــــ میری چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی ــــ میں سمجھ گئی کہ میں چور بن گئی ہوں ــــ لیکن مجھے تو ایک ایسے چور نے دبوچ لیا تھا جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چرا لیا تھا اور اس ادا سے کہ میں لٹ لٹ کر مسکرا رہی تھی۔ راتوں کی نیند اس نے چرا لی تھی۔ دن کا سکھ اس نے چرا لیا تھا۔ اور اب اس پھولوں کے جھنڈ میں آ پہونچا تھا کہ قدوائی کالج میں میرا یہ گوشۂ عافیت بھی چرا لے جو مجھے ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر اس کی بے چین نظروں کا نظارہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔
ہش ــــ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے سرگوشیوں میں کہنے لگا ــــ بس زندگی بھر ہم دونوں یہیں چھپے رہیں گے۔
میں علیم سے اس قدر قرب کے احساس ہی سے سلگ اٹھتی تھی اور اب جب کہ اس نے مجھے اپنی باہوں میں لے رکھا تھا تو میرا جسم جیسے جل رہا تھا۔ میری ساری ہستی آتش بنی ہو رہی تھی میری نس نس میں ایک آتش سیال رواں تھی ــــ میری کن پٹیاں

پھڑک رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے خود مجھے سنائی دے رہی تھی۔

پھر علیم کے ہونٹوں کا لمس میں نے اپنی گردن پر محسوس کیا ـــ میں تڑپ کر ان باہوں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ جن باہوں کے حلقے میں محصور رہ کر ساری زندگی گزار دینے کا مجھے ارمان تھا ـــ میں نے کوشش کی لیکن باہوں کی زنجیر نے مجھے کس کر رکھ لیا۔

اور ہم دونوں اسی عالم سرشاری میں اس چور کو بھول بیٹھے تھے جو قسمت کی طرح ہمارا تعاقب کر رہا تھا ـــ کہ کسی نے قریب ہی سے کہا ـــ "کوئی آ رہا ہے ـــ کوئی آ رہا ہے"

علیم مجھے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ میرے گالوں میں اڑنے والا اخون جیسے سرخی رخسار بن کر منجمد ہو گیا۔ ایک ایسے خوف نے ہماری محبتوں پر چھپ چھپ کر پیچھے سے وار کیا تھا جو خود ہماری محبتوں ہی کا پروردہ تھا۔ میں پسینے میں نہا نہا کر رہ گئی ـــ یہ کیسا لمحہ تھا۔ یہ کیسی گھڑی تھی۔ یہ کیسا پل تھا جو بجلی بن کر ہم پر گر گیا تھا۔

یہ کون ہے جو ہمیں دوسروں کی آمد کا احساس دلا رہا ہے ـــ میں تو اس سے بھی مخالف تھی جو میرے اس راز سے واقف ہو کر مجھے دنیا کی نظروں سے بچا لینے کے لیے اپنے تعاون کی پیش کش کر رہا تھا۔

تم کہیں اور چلی جاؤ روحی ـــ اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اور میں نے آواز پہچان لی ـــ یہ ساحرہ تھی ـــ میری اپنی ساحی۔ علیم کے اور میرے درمیان جو ایک رابطہ تھا۔ ایک واسطہ۔ ایک وسیلہ۔ زنجیر کی کڑیوں کا وہ جوڑ۔ جو ایک کڑی کو دوسری سے ملاتا ہے۔

"تم لوگوں نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی ـــ" وہ پھر کہنے لگی ـــ اور علیم نے

اسے بڑی ناگواری سے دیکھا لیکن ساحرہ نے علیم کی ان نظروں کی بالکل پروا نہیں کی۔
اس کا اس طرح ہمارا تعاقب کرنا مجھے بڑا ناگوار محسوس ہوا ــــ وہ آخر کون ہوتی ہے ہمارا سایہ بن گئی ہے اس کی اس دوستی کے پیچھے آخر کون سا جذبہ کام کر رہا ہے ــــ مجھے تو اس پر کچھ شک سا ہونے لگا اور یہ شک اس وقت یقین سے بدل گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ ہماری طرف کوئی بھی نہیں آ رہا تھا ــــ ساحرہ نے ہماری ایک چالاکی سے چل کر صرف ہمیں جدا کر دینے کے لیے ہمیں کسی کی آمد سے ڈرایا تھا ــــ اور میں اس لیے ڈر گئی تھی کہ ایسے میں جب کہ دو دل مل رہے ہوں، کوئی آ دھمکتا ہے تو وہ اکیلا نہیں ہوتا ہے۔ تنہا نہیں ہوتا، ایک دنیا اس کے ساتھ ہوتی ہے، ایک زمانہ اس کے ساتھ ہوتا ہے ــــ لیکن یہاں تو کوئی نہیں تھا۔

علیم اٹھ کر دوسری طرف جانے لگے تو ذکیہ نے جو اس وقت چور تھی علیم کا تعاقب کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ علیم کو جا لیتی، کوئی دوسرا ہی اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ رابی تھی جو پاس ہی پیڑ کے پیچھے چھپی ہوئی تھی ــــ اور ذکیہ رابی سے چمٹی ہوئی چلا رہی تھی۔

"رابی چور، رابی چور ــــ ساتھیو باہر آجاؤ ــــ رابی پکڑی گئی ۔"

سب کے سب چھپے ہوئے گوشوں سے کچھ اس طرح نکل آئے کہ دوسرا یہ بھی نہ جان سکا کہ کون کہاں چھپا تھا۔

میں بھی اٹھی تو ساحرہ نے میری بانہہ پکڑ کر کہا ــــ تمھیں کیا ہو گیا ہے ردی ــــ محتاط رہو ــــ کوئی دیکھ لیتا تو ــــ اور پھر ــــ اور پھر ــــ اتنا

قریب بھی تو اچھا نہیں۔

میں نے تنک کر بازو چھڑا لی ــــ اور اپنی دوسری ہمجولیوں میں بھاگ آئی۔

اس کے بعد میں نے خود کو پہلے سے زیادہ علیم سے چھپائے رکھنے کے

جتن کیے۔

آنکھ مچولی جاری رہی۔

میں نے دیکھا ساجی علیم سے کچھ ایسی باتیں کر رہی تھی جس کا علیم برا مان رہے

تھے اور یہ باتیں یقیناً ہم دونوں کی یک جائی کی مخالفت میں ہوں گی۔ میں نے

سوچا علیم سے صاف صاف کہہ دوں کہ اب تمھارے خط کے ایک ایک لفظ

کے پیچھے برس برس بھر ترسنا گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی تمھارا اور

میرا سایہ بن جائے ــــ اور واقعی مجھے ساجی سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

لنچ کا وقت آیا اور ہمیں اطلاع دی گئی تو ہم سب اکٹھے ہونے لگے۔

علیم بھری محفل میں مجھ سے بات کرتے ہوئے یوں بھی اجتناب کرتے لیکن

بعض ڈشز واقعی اتنی اچھی تھیں کہ انھوں نے بڑھ کر خود میری تواضع کی اور دو ایک

بار اپنی پلیٹ سے میری پلیٹ چپکے سے کچھ چیزیں منتقل کر دیں ــــ غنیمت تھا اور

یہ مواقع ہمیں آسانی سے فراہم ہو سکتے تھے ــــ جو ہوئے بھی۔

اس نعمت کے باوجود بھی جو مجھے حاصل ہوتی ہیں اس طرح چلنے لگی تھی جیسے کوئی

چور سارا اثاثہ بٹور کر واپس جاتے ہوئے صاحب خانہ کے قریب سے پنجوں کے بل

چلتا ہو ــــ اس دروازے کی طرف جس دروازے کو اس نے اپنی واپسی کے لیے

کھول رکھا ہو۔

لیکن ساحرہ تو علیم کی بھیجی ہوئی دولت بے کر میرے نہاں خانۂ دل میں آئی تھی ـــــ اور جب یہ دولت میں نے سوجتن سے چھپا کر رکھ لی تو وہ چوروں کی طرح بٹور کر پنجوں کے بل واپس جا رہی تھی اور وہی دروازہ اس نے واپسی کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا جس سے وہ داخل ہوئی تھی ۔

لیکن پنچ پر وہ موجود نہیں تھی ـــــ میں نے کتنا اسے تلاش کیا ـــــ اپنی ہمجولیوں اور سہیلیوں سے پوچھا ـــــ سب حیران تھے ـــــ وہ یکایک کہاں چلی گئی ـــــ کیوں چلی گئی اس کے سوا اور کوئی سہیلی موجود نہ ہوتی تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں گھوم پھر رہی ہوں گی ۔

مجھے رانی نے چپکے سے بتایا ـــــ کہ اس نے ساحی کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے ـــــ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آبدیدہ تھی ۔

میں نے کہا چلیں تو ذرا اوپر دیکھ آئیں ـــــ اس کا اسکوٹر ہے یا نہیں ـــــ بیضوی سیڑھیوں سے گزر کر ہم اوپر پہنچے تو اس مقام پر جہاں موٹریں پارک کی گئیں تھیں ۔ ساحی کی ”وسپا“ نہیں تھی ۔

ہمیں اس کی واپسی کا یقین ہو گیا اور ہم نشین چمن میں لوٹ آئے ۔

لیکن یہ بات کہ وہ آبدیدہ تھی ـــــ زہر کا بوند بوند بن کر میرے ذہن پر گر رہی تھی ۔

رانی جیسے مجھ سے دور کھڑی ہاتھ کہہ رہی ہو ۔

”وہ آبدیدہ تھی ـــــ“

پھر جیسے قریب آ کر اس نے کہا ۔

"وہ آبدیدہ تھی ـــــ"

میں نے پھر بھی نہیں سنا تو ـــــ اس نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا تھا۔

"وہ آبدیدہ تھی ـــــ"

لنچ ختم ہوتے ہوتے وہ لوٹ آئی۔

رابی نے بڑے چاؤ سے کھانا اس کے لیے میز پر چن دیا جو اس نے بڑے ہی اہتمام اور احتیاط سے ساحی کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

رابی کی اس حرکت نے ہماری دوسری سہیلیوں کے ساتھ مجھے بھی کچوکے دیے کیسی اچھی حرکت کی رابی نے۔ دوستی کی۔ محبت کی۔ ایسی حرکت جو چپکے سے دل میں دور دور تک اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہے اور پتہ تک نہیں چلتا۔

ساحی کے لیے یہی سب کچھ تو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔

میں نے دیکھ لیا تھا آبدیدہ تھی ـــــ اور میں یہ جان کر اس لیے خوش ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کی یہ نمی۔ اس کی پلکوں کا یہ بھیگا پن اسی دوستی کے ضمن میں تھا جو مجھ سے اور علیم سے وہ بیک وقت نبھا رہی تھی ـــــ اس دوستی کے ضمن میں تھا جو کبھی کبھی میرے ذہن میں اپنا روپ بدل کر ابھرنے لگی تھی ـــــ لیکن میں قطعی طور پر یہ تصفیہ نہ کر پائی تھی کہ ساحی کی دوستی اور دشمنی میں کتنا فصل ہے ـــــ اب جو وہ چپ چاپ اپنے کھانے پر جھکی ہوئی تھی۔ تو اس کی اس بے بسی پر نہ جانے کیوں مجھے سکون سا مل رہا تھا۔

میں ایسے جذبے اپنے دل و دماغ میں ساحی کے لیے پروان چڑھانے لگی تھی جو بیک وقت ہمدردی اور نفرت کے پروردہ تو ہوتے ہیں لیکن محبت کے

پیدا کردہ کبھی نہیں ہوتے۔

اور یہ سارا انقلاب مجھ میں آج ہی پیدا ہوا تھا۔

اسی قدوائی کالج میں جس کے گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ جو بلندی سے ان شاخوں میں بیضوی شکل میں بٹ گئی ہیں۔ اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں ـــــ اس قدوائی کالج میں جہاں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میں اپنی مرضی سے سب سے پیچھے رہ گئی تھی اور بلندیوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اجلے اجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا تھا۔ جو ان بیضوی سیڑھیوں پر موتیوں کی مالا بن گیا تھا ـــــ اور یہ مالا نشیب میں پہونچ کر ٹوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے۔

اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بکھرے ہوئے موتی اگر مالا کا روپ دھار لیں بھی تو وہ موتی اس میں نہ پروئے جا سکیں گے جو میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ تاب دار تھے۔

اور وہ موتی تھے علیم میں اور ساحی۔

ساحی کھانا کھا چکی تھی اور میز سے اٹھی تو میں بھی اس کی اداسی سے سکون پا کر خیالات کی دنیا میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ قدوائی کالج میں اس طرح لوٹ آئی جیسے مجھے اذیت تھے میں اپنے محبوب کی اماں یا نانی ہیں ہے بلکہ کسی چھپے ہوئے دشمن کے مضبوط بازوؤں کے بھرپور وار سے بچ نکلتا ہے۔

اور میں اپنے انہی تصورات کے ساتھ جیسے ساحی کے مقابل ہو گئی۔

پنچ کے بعد بوڑھوں نے سستانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس سستانے میں نیم دراز ہو کر قیلولہ کرنے سے لے کر پان دان کھول کر گلوریاں بنانے، پھر گلوریاں منھ میں رکھ کے جگالی کرنے تک کے سارے مشاغل شامل تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں، تفریحوں میں جب کہ زندگی ذرا تیز گام ہو جاتی ہے بڑے بوڑھوں کا گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایوں میں ذرا کی ذرا پل بھر کو سستا لینا، منچلے نوجوانوں کے لیے لمحۂ فکر بھی ہوتا ہے اور لمحۂ نشاط جاں بھی۔

ایک تو ایسا لگتا ہے جیسے بزرگوں نے جن کی عقابی آنکھیں چمن میں جھومتے ہوئے پھولوں پر نظر رکھتی ہیں۔ ان کی اڑتی ہوئی خوشبو پر نظر رکھتی ہیں۔ تھک ہار کر کہیں بیٹھ رہی ہیں تا کہ "آگے چلیں گے دم لے کر" اور ان لمحاتِ فرصت میں پھول زیادہ جھوم لیتے ہیں۔ خوشبو ہر نفس کے لیے شمیم جان بن جاتی ہے۔

پنچ کے بعد یہی سب کچھ ہو رہا تھا ــــ پنچ کے بعد قدوائی کا لج میں ایک دنیا اونگھ رہی تھی، ایک دنیا نئی ترنگوں کے ساتھ کسمسا کر بیدار ہو رہی تھی۔

بیدار ہوتی ہوئی دنیا نے اپنے پر تولے ــــ چلو چلتے ہیں ــــ ذرا ادھر ادھر گھوم آئیں۔ شام ہوتے ہوتے تو واپسی ہو گی ــــ گھومنے پھرنے کا اب یہی تو ایک موقع ہے۔

بات دبی زبان سے نکلی تھی جو نعرہ بن کر زبان زد ہو گئی ــــ اور جیسے اس نعرہ بازی سے بوڑھے چونک اٹھے۔

نہیں بھئی پنچ کے بعد یہ گھومنا پھرنا کہاں کی دانش مندی ہے پنچ کے بعد تو سستانا چاہیے ــــ کچھ تاش چلنے دو بیٹھے یہیں پر۔"

ہم نے ایسا کون سا تمغہ ایچیو کیا ہے ـــ بھی جتنا آپ لوگ ناشتہ کرتے ہیں "
سب ہنس پڑے بزرگ بھی نوجوان بھی ـــ سبھوں نے پلٹ کر دیکھا ـــ ساحی
یہ جملہ کہہ کر ایسی چپ چاپ کھڑی تھی جیسے صدیوں تک بھی مسکرانا بھول گئی ہو۔

ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑے ـــ فردوسی کالج کے احاطے سے باہر
نکلتے وقت گیٹ کی اوٹ سے کسی نے میری باہنہ پکڑ لی میں ذرا رک گئی تو علیم
نے مجھے تڑپ کر اس طرح دیکھا جیسے زندگی بھر ایک لمحے کو مجھ سے جدا ہوئی تھی وہ
سہہ نہ سکیں گے ـــ میں نے آنکھوں آنکھوں میں انہیں تسلی دی کہ بس اب ان تک
پہونچتی ہوں ـــ لیکن گیٹ کی اوٹ میں چھپی ہوئی ساحی پر نظر پڑتے ہی علیم
بگٹٹ ہمارے پاس بھاگ آئے۔ ایسے جیسے ہم دونوں کی یک جائی سے ڈرتے ہوں
ـــ ہم دونوں کا سر ایک دوسرے سے جڑ کر آہستہ سے ٹکرایا ـــ پھر بڑے
چاؤ سے ساحی کے دونوں ہاتھ علیم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیے ـــ
انہیں بڑی نرمی سے دبایا ـــ پھر گال سہلائے ـــ ہچکیاں آتی ہیں گی ـــ اس قدر
برا مان جاتی ہے ـــ

ساحی میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تو علیم پیچھے رہ گئے ـــ لیکن اس منٹ
بھر میں میرا یہ حال ہو گیا تھا۔ جیسے سر بازار اس آدمی نے میرے منھ پر تھوک دیا
ہو۔ جس کو میں چاہت کی نظروں سے تک رہی تھی۔ میں بھلا ساحی پر ترس کھانے
چلی تھی ـــ اس ساحی پر جس نے مجھے اپنے برابر کھڑے رہنے کے قابل بھی
نہ رکھا۔

علیم کی اس حرکت نے مجھے جیسے بلندی سے گرا دیا تھا۔ ایسی بلندی سے جس پر

علیم خود میرا ہاتھ تھام کر لے گئے تھے۔

ساحی مجھ سے کہنا چاہتی تھی ـــــ بڑی لجاجت سے اتنی لجاجت سے کہ شاید وہ میرے پیر بھی تھام لیتی ـــــ شاید شاید وہ علیم کو مجھ سے مانگ لینا چاہتی تھی ـــــ لیکن جب خود دوڑ کر اس کے آگے جھک گئے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ساحی نے میری غلط فہمیوں کے منھ پر ایک طمانچہ مارا ہے منٹ بھر میں، پھر ایک بار ساری بساط الٹ چکی تھی ـــــ میں سوچ رہی تھی کہ علیم میرے ہیں یا ساحی کے ـــــ دست سوال مجھے دراز کرنا پڑے گا یا ساحی کو ـــــ میں تو، جب ساحی آبدیدہ ہو کر اس انجمن سے فرار ہوئی تھی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں ساحی پر جب چاہے مسکرا سکتی ہوں۔ جب چاہے مسکرا سکتی ہوں۔

لیکن اب خود میرا یہ حال ہو گیا تھا کہ ساحی تو کیا ہر شخص مجھ پر ترس کھا سکتا تھا۔

ساحی نے اپنے قدم تیز کر دیے تھے۔

میں پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ شاید سمجھ رہی تھی کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

علیم اس طرح گم سم تھے۔ جیسے ہار جیت کا نقشہ جا رہے ہوں ـــــ میں نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا ـــــ میرے اندر کی عورت پھر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ عورت جو مرد کے قدموں تک جھکنا گوارا کر سکتی تو عورت کے آگے سر خم کرنا کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اور پھر ایسی صورت میں جب، کہ اس کی محبت چھینی جا رہی ہو۔

میرا پندار اب اس عورت کا پندار تھا جس کی دوسری عورت نے محبت

چھین کر ہی زخمی نہیں کیا تھا بلکہ جس کا محبوب خود بڑی امانت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس عورت کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جس نے محبت چھپی تھی۔

روٹی ٹھہر جاؤ۔

پیچھے سے علیم نے مجھے اس طرح پکارا جیسے ان کی آوازمیں دنیا بھر کا دکھ درد سمیٹ آیا ہو۔

ساتھی مجھے اور علیم کو پیچھے چھوڑ کر شاید بھول ہی جاتی تھی۔

میں بھی چاہتی تھی کہ علیم کو پیچھے چھوڑ دوں ——

لیکن ساتھی سے آگے نکل جاؤں ایسی کوئی بات میرے بس میں نہ تھی۔

پھر بھی میں نے اپنے قدم اور تیز کر لیے۔

علیم نے بالکل اس طرح پکارا جیسے پپیہا پی کہاں، پکارتا ہے۔

میں نے بار ہا پپیہے کی آواز کو اس طرح بھی محسوس کیا ہے۔ جیسے یہ آواز اپنے دل سے پیدا ہو رہی ہے، میری اپنی زبان سے نکل رہی ہو اور میرے اپنے ہی کانوں میں وہ درد ٹپکا رہی ہو۔

لیکن آج میں نے علیم کی اس آواز کو سُنی ان سُنی کر دیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے اس آواز کی لذتوں سے میں آشنا ہی نہیں ہوں۔

ساتھیوں کی ٹولی مسلسل نشیب و فراز سے ہو کر گزر رہی تھی۔ بیری کے گھنے درختوں کا ایک سلسلہ سا دور تک شروع ہو رہا تھا اور یہ ٹولی اس سلسلے کے بیچوں بیچ پہونچ چکی تھی۔ جب کہ بیری کے یہ سائے میرے قدموں کے نیچے ابھی ابھی جھکے تھے۔ علیم ابھی دھوپ ہی میں تھے اور سایوں تک پہونچ نہ پائے تھے۔

یکایک دو پرندے پاس ہی کے ایک پودے سے اڑے اور بیری کی ٹہنی پر بیٹھ کر محو اختلاط ہو گئے۔ میری نظریں ان پر جم گئیں تو کسی نے ہاتھ بڑھا کر میری آنکھیں ڈھانپ لیں۔ میں نے تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا تو باہوں کے حلقۂ زنجیر میں جکڑ کر رہ گئی۔ علیم پیر دبا کر پتہ نہیں کب مجھ تک آ پہونچے تھے ــــــ ان کے قدموں کی چاپ یا تو میں نے سنی نہیں یا پھر مجھے اپنے دل کی دھڑکن کا گمان گزرا ہوگا جو میں نے اس کو نہیں پہچانا۔

بیری کے ان درختوں سے پرے ذرا سے نشیب میں ایک جھاڑی کے پیچھے ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی ــــــ میں اور علیم جدا ہوئے تو یہ چیخ کراہ میں بدل گئی۔

لیکن میں ابھی تک اپنی ہی آگ میں جل رہی تھی ــــــ میرا سارا وجود خود ہی ایک چیخ بن کر رہ گیا تھا۔ میری ہستی خود ہی مجھے ایک کراہ معلوم ہو رہی تھی۔

اور مجھ میں بیدار ہوتا ہوا عورت کا پندار اس مٹھاس میں تلخیاں گھول رہا تھا۔

اور پاس ہی کوئی کراہ رہا تھا۔

بالکل اس طرح جیسے میرا وجود کراہ رہا تھا ــــــ میری زخمی روح کراہ رہی تھی۔

علیم سے جدا ہو کر میں بڑی بے دلی اور سرد مہری سے آگے بڑھنے لگی تو اس کراہ نے دامنِ دل کو پھر سے تھاما۔

واقعی کوئی قریب ہی تھا۔

میں نے پلٹ کر علیم کو صرف اس لیے دیکھا کہ ان سے کہہ سکوں کہ وہ اس کراہ کی تہہ تک پہونچیں۔

وہ بھانپ گئے ــــــ کہنے لگے تم بھی چلو۔ دیکھتے ہیں۔

ہیں زندگی بھر کے لیے علیم کا قرب چاہتے ہوئے بھی کم از کم اس وقت ان سے دور رہنا ہی چاہتی تھی تاکہ وہ میری سے پوری طرح متاثر ہوں کیونکہ ان کا قرب میرے غم وغصہ کے اظہار کے لیے مشکل تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر توقف کرکے انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے التجا کر رہے ہوں لیکن جب میں نے نظریں پھیریں تو وہ آگے بڑھ گئے۔

جھاڑی کے قریب پہونچے تو نشیب میں انھوں نے جھانک کر دیکھا اور ٹھٹک سے گئے ۔۔۔

میں نے دور ہی سے پوچھا کیا بات ہے۔ انھوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا ۔۔۔

پہلے تو میں نے پس وپیش کیا۔ پھر کراہنے کی آواز سنی تو قدم خود بخود اٹھ گئے ۔۔۔

قریب پہونچی تو علیم نے مجھے سہارا دے کر نشیب میں جھکایا۔

وہاں تو ساجی کانٹوں میں الجھی ہوئی پڑی تھی ۔۔۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی ۔۔۔ میں نے علیم سے کہا ۔۔۔ کود پڑئیے نا آپ بھی۔ اٹھا لائیے بے چاری کو اب تو وہ چلنے کے لائق بھی نہ ہوگی۔ آپ ذرا سا اٹھالیں تب ہی بیڑا پار ہو۔

طنز کے یہ نشتر علیم نے سہہ لیے اور چپکے سے نشیب میں سنبھل سنبھل کر اترنے لگے ۔۔۔

مجھے ان کی یہ حرکت اور بھی بری لگی کہ انھوں نے میرے دل کی لگی کو سمجھ کر

بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ـــــ چھوٹے مہر تو کہہ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

علیم نے جھک کر ساجی کو سہارا دیا تو اپنی دونوں بانہیں ان کی گردن میں حمائل کر کے وہ جھول گئی ـــــ اور اتنی سفاکی سے ـــــ کہ میں جل گئی۔

یہ معاندانہ رویہ اس طرح کھلے بندوں ساجی نے کبھی اختیار نہ کیا تھا ـــــ میرا اپنا عالم یہ تھا جیسے میری اپنی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے میں نے ہی اپنا کفن سرکا ہو اور میں اپنے مردہ چہرہ پر حسرتوں کی پرچھائیں پڑھ رہی تھی کہ جیسے ساجی نے نفرت سے چہرہ ڈھک دیا۔

علیم سہارا دیکر اسے اوپر لے آئے تو وہ بدقت تمام علیم کے سہارے لنگڑاتی ہوئی مجھ تک پہونچی ـــــ اور میرے قریب آ کر یکایک اچھل پڑی۔

پھر اچھل اچھل تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگی۔

میری حالت دیدنی تھی۔ اس سے اچھا تو یہ تھا۔ کہ ساجی مجھے طمانچہ لگا دیتی بلکہ برچھی سے میرا سارا سینہ چھلنی کر دیتی۔ میرے دل میں ایک نہیں کئی پسٹل کی گولیاں اتار دیتی ـــــ مجھے تو یہ احساس تو ہوتا کہ میں اس کے برابر کی کوئی ہستی ہوں ـــــ لیکن ساجی نے ایسا کچھ بھی تو نہ کیا ـــــ میرے پندار کو، میری زندگی کو، میری محبت کو اس نے اپنے قدموں پر جھکایا ان کی تذلیل کی تو پھر ٹھوکر لگا کر جیسے مجھ سے کھیلنے کے سے انداز میں تالیاں بجا کر ہنسنے لگی۔

مجھ سے رہا نہ گیا ـــــ کسی اندرونی جذبے نے میرا ہاتھ اٹھوا دیا قریب تھا کہ اس کے گالوں پر میں طمانچہ جڑ دیتی کہ علیم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

علیم کی اس طرفداری نے جلتے پر تیل کا کام کیا اور میں کانپ کانپ

گئی پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ کر آنسو اس طرح میری آنکھوں میں امڈ آئے کہ میں نے بھی ان طغیانیوں میں بہہ جانے کو اپنی عافیت جانا ——— میں اتنا روئی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

ساحی نے مجھے اس طرح بے حال دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔

پھر یکایک اس نے سر میرے سینے پر ٹیک دیا۔

رندھے ہوئے گلے سے وہ کہنے لگی ——— روحی میں اس وقت بہت خوش ہوں بجی۔ اس لیے کہ آج میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ تجھے تیری وہ خوشیاں بھی لوٹا دوں جو میں نے اپنے لیے اٹھا رکھی تھیں لیکن تو نے مجھے بالکل غلط سمجھ لیا ہے کچھ پتہ ہے تجھے ——— میں نے آج تک دوسروں میں صرف خوشیاں ہی تقسیم کی ہیں اور سارے غم اپنے ہی پلو میں باندھ رکھے ہیں۔

خالد نے ایک دن چنبیلی کی کچی کلیاں میرے دامن میں ڈال کر کہا تھا یہ ذکیہ کو چپکے سے دے آنا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ یہ کلیاں میں کیوں نہیں رکھ سکتی۔

عید کے بھرے گھر میں عرفان نے میرا ہاتھ پکڑ کر بڑے چاؤ سے مجھے گھما میں ہاتھ چھڑا کر لمبی لمبی سانسیں لیتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ——— دل نے اس مختصر سے حادثہ کو کیسے کیسے رنگ دیے ہیں۔ میں نے کیسی کیسی خیالوں کی دنیا آباد کی ——— اسے پائیں باغ کے کنج میں کسی کا منتظر پایا تو اس طرح چلی گئی جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ وہاں کسی کا منتظر ہے وہ لپک کر مجھ تک پہنچا بڑے چاؤ سے اس نے مجھ سے کہا ——— "یہ عید کارڈ رابی کو دے آؤ نا ساحی ———

میں تیرے لیے ــــ"

اندر میں عید کارڈ دے کر چلی گئی ــــ رابی کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیا تو اس نے کہا یہ پانی کے قطرے کہاں سے ٹپکا لائی ــــ میں رابی کو کیسے بتا دیتی کہ وہ پانی کے قطرے نہیں تھے ــــ میرے آنسو تھے جو عرفان کی لکھی ہوئی تحریر کو دھندلا رہے تھے۔

پھر ــــ پھر علیم نے میرے سہارے تم تک پہونچنے میں بہت ہی دیر لگائی اتنی دیر کہ میں خود ان کے سہارے کچھ دور چل پڑی تھی۔

اپنے پلو کی گرہ سے گلاب کی پنکھڑیاں نکال کر اس نے میری بند مٹھی کو کھولا۔ اور نہایت ہی احتیاط سے رکھ کر پھر مٹھی بند کر دی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت عمیق، بہت گہرا جس کی کوئی تھاہ نہ تھی۔

وہ جانے کے لیے پلٹی تو میں نے دیکھا اس کی ناگوں جیسی بل کھاتی لمبی لمبی زلفوں میں دو بڑے بڑے گلاب مسکرا رہے تھے۔

میری نظروں میں علیم کی وہ تحریر پھر گئی جو ساجی کے ہاتھوں مجھ تک پہونچی کہ "میں نے تمھارے لیے یہ پھول کسی کومل سی ایک شاخ سے جدا کیا تھا کہ اسے تمھاری زلفوں کی لمبی سیاہ رات کا چمکدار ننھا سا ستارہ بنا دوں"

لیکن ان پھولوں کا اس سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ان دونوں سیاہ ناگوں کو پکڑ لیا تو اس نے بہت تیزی سے ان پھولوں کو اپنے بالوں میں ٹھیک کر لیا جو اس کی دانست میں اس کی گھنی

زلفوں کے ایک بال چھونے سے بھی گر سکتے تھے۔ اور اس نے خود ناگن کی طرح بل کھا کر، تڑپ کر مجھے دیکھا۔

"اتنے پیارے ہیں تجھے یہ پھول؟"

"ہاں ــــ انہی پھولوں نے تو مجھے اتنا پاگل بنا دیا تھا۔ ساحی کہ میں تجھے ہنسانے کی بجائے رُلا بیٹھی۔"

میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں ــــ "مجھے نہیں بتائیے گی؟"

اس نے قریب قریب اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے ــــ اور بہت آہستہ سے کہا۔

"وہ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس جھاڑی کے پاس میرے منتظر تھے ــــ میں قریب پہونچی تو انھوں نے بڑھ کر جب یہ پھول پیش کیے اور نظریں جھکا لیں۔ تو میں نے پوچھا ــــ

"یہ پھول میں کیسے دے آؤں ــــ" جلدی سے بتا دیجیے۔

وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر کہا ــــ "بتا دیجیے ــــ کہ آخر یہ پھول میں کیسے دے آؤں؟"

انھوں نے کتنی بے بسی سے کہا ــــ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ یہ پھول تمھاری نذر کر سکوں ــــ اور ان کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسو انہی پھولوں کے سینے میں کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھول ان کے ہاتھ سے لے لیے اور خود ہی انھیں اپنے بالوں میں سجا لیا۔

ساحی اتنا کہہ کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ــــ آنسو کا سمندر ساحی کی آنکھوں ہی میں کہیں گم ہو گیا تھا اور اب وہاں سکون اور شانتی کے لمبے سائے تھے۔

"کون تھا وہ —" میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ادب سے نام لے پگلی —" اس نے پھر اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے۔

"تیرا بھائی جان —" میں تڑپ کر رہ گئی — نہ خوش ہو سکی، نہ ساجی کو گدگدا سکی

"تو، تو، میری بھابی —"

"ہاں —" ساجی نے بات کاٹ دی اور اپنے بالوں میں سجے ہوئے پھولوں کے سوجتن سے بچھولی ہوئی اور ہرنوں کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی —

میری پہلی بھابی کو مرے کوئی چار برس ہوئے تھے اس وقت بھائی جان کے تین لڑکیاں تھیں ان کی سب سے بڑی لڑکی، ساجی سے دو ایک برس چھوٹی ہو گی۔
میں بھول گئی کہ میری ایک بند مٹھی میں گلاب کی پنکھڑیاں بھی ہیں — کچھ پنکھڑیاں گر کر بکھر گئیں تو علیم نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہنے لگے "کچھ بتاؤ بھی روحی آخر کیا بات ہے"؟

میں نے کہا — "چلیے آگے چلیں — ہم ساجی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

تین مسافر

پنچ تتو کا بنا ہے پنجرہ   اس میں بیٹھی مینا
مینا کی گت مینا جانے   جھیکن لاگی دنیا

اپنی لاٹھی سے آنکھوں کا کام لیتا ہوا وہ کمپارٹمنٹ میں مسافروں کے بیچ راستہ ٹٹولتا ہوا آگا رہا تھا آواز اچھی خاصی تھی یا پھر ماحول کی اداسی نے شاید اس کی آواز میں سننے والوں کے لیئے زیادہ درد بھر دیا تھا۔ اللہ کے نام پر پیسہ مانگنا ہو تو دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی غیر یقینی کا ذکر کر کے اللہ سے خوف دلانے کا گر پرانا سہی لیکن ہے کارگر اور پھر ایسی صورت میں جب کہ لوگ اپنی ہی آنکھوں زندگی کی بے مائیگی کا حشر دیکھ رہے ہوں۔

ایکسپریس اپنی پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ ساری کائنات اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں اور شیشوں سے جو روشنی زمین پر پڑ رہی تھی وہ بھی ایکسپریس ہی کی

رفتار سے اس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اندھیرے میں کھوئے پودے، درخت اتار کے کھمبے سکنڈ، دو سکنڈ کے لیے اجالوں سے جھپٹ کر انھیں اپنی باہوں میں جکڑ لینا چاہتے تھے لیکن اجالے بڑی بے رحمی سے انھیں تاریکیوں میں پھینک کر آگے بڑھ رہے تھے۔

البتہ کمپارٹمنٹ اجالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کتنی ہی زندگیاں سر جوڑے موت کے خلاف سازش کر رہی تھیں اجالے صرف کمپارٹمنٹ میں تھے۔ سفر کرنے والوں کے سینوں میں بھی جیسے باہر کی تاریکیاں در آئی تھیں ـــــ اور وہ گا رہا تھا۔

پنچ تتو کا بنا ہے پنجرہ

ایک بوڑھی بیوہ برہمن گنجے سر پر سفید ساری کا پلو اوڑھے آنسو خشک کر رہی تھی ایک لمبے بالوں والا دبلا پتلا سا نوجوان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے کھڑکی سے لگا ہوا شیشے میں سے چھنتی ہوئی روشنیوں کو تک رہا تھا جو اندھیروں سے گھبرا کر اس کی نظروں کے ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ ایک اینگلو انڈین ادھیڑ عمر کی فربہ عورت اپنی عینک کے شیشے اسکرٹ کے دامن سے صاف کر کے عینک کو اپنی آنکھوں کے سامنے گھما رہی تھی اور یہ عمل اس نے دو تین بار کیا تھا ـــــ ایک سندھی عورت اپنی اوڑھنی میں اپنے بچے کو چھپائے دودھ پلا رہی تھی لیکن وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر دور دور تک ممتا کا پتہ نہ تھا ـــــ ایک پہلوان قسم کا گھٹے ہوئے سر اور نوکدار مونچھوں والا آدمی اب اپنی مونچھوں پر تاؤ دینا اس طرح بھولا ہوا تھا۔ جیسے یہ اس کی عادت ہی نہ ہو۔

بھک سفید داڑھی والے ایک مولوی صاحب منہ ہی منہ میں کچھ ورد کرتے ہوئے بہت جلد جلد تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے ان کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں

بھی کھل جاتیں۔ دو چار آدمی ایک پنڈت کو گھیرے ہوئے اس کی معلومات افزا
باتیں سن رہے تھے بیچ بیچ میں کوئی کچھ پوچھ لیتا۔ لیکن مکرر پوچھنے کی یا تو ہمت نہ کرتا
پھر دانستہ گریز کرتا ـــ پنڈت جی ذہنی طور پر اندھے بھکاری کے گائے ہوئے
دوہے سے زیادہ قریبی ربط ضبط رکھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

پنچ تتو کا پنجرہ بنا ہے، اس میں بیٹھی مینا
مینا کی گت مینا جانے، جھکن لاگی دنیا

اور ابھی تک گا رہا تھا۔

"کس طرح پھینک دے گا اٹھا کر کوئی" کوئی کہہ رہا تھا آواز میں رقت تھی۔

"ہاں بھائی یہ غم تو زندگی بھر کا ہے لیکن مذہب یا عمل قابل ترجیح ہو تو گریز سے
فائدہ"ـــ آواز میں دور دور تک کسی جذبے کا پتہ نہ تھا۔"

اب آپ ہی سمجھائیے مولوی صاحب۔ پنڈت جی نے اس آواز کی طرف
مخاطب ہو کر کہا۔

دودھ پلاتی ہوئی سندھی عورت نے راست جیتن بابو سے سوال کیا "تمھاری
عورت کہاں ہے جی"ـــ لیکن جیتن بابو بس مبہوت بنے سامنے پڑی ہوئی اپنے
لخت جگر کی لاش کو تک رہے تھے جس نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے دم توڑا تھا۔
سندھی عورت کا سوال ان کے کانوں تک پہنچا ہو گا لیکن حس سماعت تک پہنچ
سکا یا نہیں۔ اس کا کچھ علم نہ ہوا۔ اس لیے کہ جیتن بابو نے اس کی طرف نظر اٹھا
کر بھی نہیں دیکھا۔

پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا "کچھ ہی ماہ ہوئے ہیں وہ

بیکنٹھ سدھار گیئی ہیں۔ مجھے انھوں نے بتایا تھا۔"

"چلو جی اس کی نانی تو اس کے سواگت کے لیے وہاں ہے۔" سندھی عورت نے بڑے ہی اطمینان سے یہ بات کہی جیسے اس نے سوال ہی اس جواب کی امید میں کیا تھا۔

پنڈت جی گنگا کی پوترتا، فضیلت اور تقدس کی باتیں کر رہے تھے، اندھا بھکاری اب خاموش ہو چکا تھا۔ اور اپنی لاٹھی تھامے کمپارٹمنٹ کے دروازے سے پیٹھ لگائے اکڑوں بیٹھا بیڑی کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

چیتن بابو اپنی پچھلی زندگی کے شاداب ویرانوں میں بھٹک رہے تھے۔ اپنی بیٹی کی سیندور بھری مانگ کو پہلی بار چوم لینا ہی ایک نئے مہمان کی آمد کا پیام بن گیا تھا اور جب یہ بات ان کے کانوں تک پہونچی تھی تو وہ خوشی سے باؤلے ہو رہے تھے انھیں اندازہ تھا کہ..... الہ آباد سے اپنا میکہ چھوڑ آنے کے بعد ان کی گڑیا سی دھرم بیٹی کتنی اداس اداس سی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو چیتن بابو سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو جھٹ بنارسی ساری کے پلّو نے ٹیڑھی ٹیڑھی گھنی گھنی پلکوں میں جھل مل کرتے آنسوؤں کو جذب کر لیا ہے۔ پھر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹیں نازک سے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہیں کہ ٹیڑھی میڑھی گھنی پلکوں کے آنسو ماند پڑ گئے ہیں لیکن چیتن بابو کو پتہ تھا کہ ان مسکراہٹوں کے نیچے بابل کا گھر چھوٹنے کے دبے دبے غم کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ جو بہرحال ان آنکھوں سے تو نہیں چھپ سکتی تھیں جو دل کی بات سمجھتی تھیں۔

اب جو ننھے کی آمد آمد کی خبر چل نکلی تو اڑوس پڑوس میں دیکھتے کے دیکھتے

سب ہی نے سنا۔ لیکن اس میں نہ کوئی اچنبھے کی بات تھی نہ چونک پڑنے کی۔ وہ لوگ چیتن بابو سے تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے انھیں چھیڑا بھی، مبارک باد بھی دی۔

رنگ برنگ کی ساریاں گھر کے بر آمدے میں لہرائیں، سرسرائیں، بکھر ان رنگوں کے بیچوں بیچ چیتن بابو کی بیٹی نے ایک اور رنگ کا اضافہ کیا۔ پھر سہیلیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ دبائے، ٹھوکے دیے، چٹکیاں بھریں اور چیتن بابو کی دھرم پتنی لجاتی رہیں، سمٹتی اور مسکراتی رہیں۔

اننا آیا بھی تو بڑی دھوم دھام سے آیا ــــ الہ آباد سے چیتن بابو کا سالے کا سالا سسرال حیدر آباد اٹھ آیا تھا۔

جنم پتریاں دیکھی گئیں نام رکھا گیا تو لڈو تقسیم ہوئے مندر سے لمبی جٹاؤں والے فقیر پکڑوائے گئے۔ انھیں پیٹ بھر کھلایا گیا۔ پنڈتوں کے جمنی کے لیے خاص اہتمام کیے گئے۔

چیتن بابو کی سسرال نے پنگوڑے کی رسم میں دل کی ہر خواہش پوری کی۔ ایک منیلیں کئی جوڑے قمیص بش شرٹ، بابا سوٹ، سیلر سوٹ، بنیائن موزے، سوئٹر، کنٹوپ، پھر کھلونوں کا اچھا خاصا چھوٹا سا خزانہ۔

اس کروفر سے آئے ہوئے نئے مہمان نے ان سے استفادہ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ ننھا بیچارہ سدا کا مریل تھا، ذرا منھ پر پانی آیا کہ پھر بجھی نکال بیٹھا۔ نہ غوں نہ غاں۔ "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کے مصداق پڑا پڑا اٹکر ٹکر ماں کا منھ تکے جاتا ــــ سال بھر کے ہوتے ہوتے دنیا بھر کے بچے تو دنیا بھر ہی کا اثاثہ بٹورتے پھرتے ہیں۔ رکھنے کی چیزوں کو توڑتے ہیں توڑنے کی چیزوں کو جوڑنے کی

کوشش میں اور بھی توڑتے پھوڑتے ہیں۔ لیکن ننھے کی عمر سال بھر سے اونچی ہو گئی
پھر دیکھتے دیکھتے دو سال کی زندگی کا تجربہ ان کے پیچھے تھا لیکن اس کو کچھ بھی نہ آیا
بس رونے سے مطلب تھا۔ ہنستا بھی تو بسورتا ہوا محسوس ہوتا۔ چھن چھنا تی مٹھی اور
جھن جھنے سے گزر کر عمر کا کارواں لکڑی کے گھوڑے اور گیند بلے تک آ پہونچا
تھا۔ لیکن ننھا بس اس طرح جئے جا رہا تھا۔ جیسے کسی چیز سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔
دوڑنے بھاگنے کی عمر میں رینگنے کی کوشش کرنا اس بات کی دلیل تو نہ تھی کہ
ساتھ کے بچے جوان ہوں گے تو ننھا بیچارہ انگوٹھا چوستا پھرے گا اور پھر ماں کا دل
ماں کا دل ہے۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ ننھے کے ان ساری کوتاہیوں کے باوجود
لاڈلے تلے تھے۔ مندروں میں دیے جلائے جاتے۔ پنڈتوں کو دان دیا جاتا۔ یہانتک
کہ بھگوان کے نام پر گئو ماتا چھوڑی گئیں۔ مندر میں دیے جلتے رہے۔ پنڈتوں
کو دان ملتا رہا۔ گئو ماتا کبھی سبزی والی کی ٹوکری پر کبھی غلے والے کی بوری پر
منھ چلالی اور ہتر کھاتی رہیں۔ لیکن ننھا بے چارہ جوں کا توں رہا۔
یہاں تک کہ رنگ برنگی ساریاں گھر کے برآمدے میں پھر لہرائیں۔ سرسرائیں
پھر ان رنگوں کے بیچوں بیچ جیتن بابو کی دھرم پتنی لجاتی رہیں۔ سمٹتی اور سکڑتی رہیں
پھر دیکھتے کے دیکھتے ایک اور زندگی کا اضافہ ہو گیا۔
نئے کی آمد نے ننھے کی قدر و منزلت میں بہت کمی کر دی۔ کرنے والوں نے
یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کیا اور ـــــ محسوس کرنے والوں نے بھی غیر شعوری
طور پر محسوس کیا۔ اب نہ ننھے کے وہ چونچلے تھے نہ ٹھاٹھ باٹھ جیتا جاگتا برابر کا
حق دار پیدا ہو گیا تھا۔ جیتن بابو کی پتنی ویسے اس سے غافل نہ تھیں بلکہ وہ تو

ابھی تک ننھے ہی پر زیادہ توجہی ہوئی تھیں لیکن منا بھی تو سینے سے چمٹ کر دودھ پیتا تھا۔
جوں جوں دن گزرتے گئے منے کے کارناموں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ جو بات ننھے
نے نہیں کی تھی منے نے سب کچھ کر دکھایا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے ماں کے دل میں
اس طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ منا بیٹا منا راجہ بن بیٹھا۔ بات کہنے کی نہیں لیکن
محسوس تو کچھ یوں ہی ہوتا ہے کہ دلوں کی دونوں بستیوں پر منا راجہ کی حکومت
ہے چیتن بابو کی محبت بھی کھلے بندوں دیکھی اور سمجھی جا سکتی تھی۔ علانیہ معلوم ہوتا
تھا کہ ترازو کا جھکاؤ کس طرف ہے لیکن ماں کا معاملہ بڑا گمبھیر ہوتا ہے حکم لگانا مشکل
ہی تھا منا کہ منا راجہ نے ننھے کو ماں کے دل سے نکال پھینکا ہے۔ کبھی کبھی کچھ
ایسا اندازہ ہو بھی جاتا تو دوسرے لمحے ہی یہ بات بالکل جھوٹ معلوم ہوتی۔
کچھ دنوں سے ننھے کی صحت کچھ اور گر گئی۔ علاج معالجہ میں چیتن بابو نے
کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ لیکن مایوسیاں تھیں کہ بڑھتی ہی جاتیں۔ پھر ایک
دن مختصر سی علالت کے بعد ان کی دھرم پتنی سورگباشی ہو گئیں تو چیتن بابو
کچھ اس طرح دل تھامے زندگی بسر کرنے لگے جیسے ان کی پتنی دنیا سے اٹھ کر ان
کے من میں آبراجی ہوں۔

ننھے کے لیے انھوں نے سب کچھ کر دیکھا۔ مرحوم ماں کی تمنا تھی کہ کاشی
جا کر ننھے کی صحت وہاں سے مانگ لائیں۔ پتر توں نے بھی جب اس خواہش
کو ہوا دی تو چیتن بابو نکل پڑے تھے۔ ننھا اور منا دونوں ہی ساتھ تھے ننھا پانچ
سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن تین سال کے منے سے دیکھنے میں کم ہی لگتا۔
اور اب ننھے نے منزل پر پہونچنے سے پہلے ہی راستے میں چیتن بابو کا ساتھ

چھوڑ دیا تھا۔ منا دوسری برتھ پر ان کے برابر ہی سو رہا تھا۔ اور وہ پھر یکبارگی میں تھکا تنہا سے بیٹھے اس خیال سے الجھ رہے تھے کہ اپنے جگر گوشے کو رات کی اس بھیانک تاریکی میں کس طرح اٹھا کر گنگا مائی کی آغوش میں پھینک سکیں گے وہ امانت جو مستقبل کے ہاتھوں سونپی جانی تھی کس طرح دریا کے حوالے کی جا سکتی تھی۔

جیتن بابو کے دل میں ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس کے انتظار میں تھا یہ سمندر بالکل خاموش، ایک لہر نہیں ایک موج نہیں۔

اور گنگا مائی اپنی پوترتا کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

انجن مسلسل چنگھاڑ رہا تھا پنڈت جی کی باتیں انجن کی کرخت چیخ و پکار میں دب دب جاتی تھیں وہ کہہ رہے تھے۔

" راجہ سگر نے ایک رشی سے نازیبا برتاؤ کیا تھا۔ اس کے شراپ سے راجہ سگر کا سارا خاندان پتھر کا بن گیا۔ بھگوان کی لاٹھی بے آواز ہے بھائی" پنڈت جی کا مزید لیکچر اس کے بعد سنائی نہ دیا۔ انجن کے تازہ دم ہونے کے لیے لمحہ بھر کو چیخ و پکار بند کی۔ تو پنڈت جی کی آواز پھر ابھری۔ وشنو نے بھاگیرت سے کہا کہ دیکنیٹھ لوک میں گنگا بہتی ہے۔ یہ لوک تک لے آئے گا۔ بچہ تو پتھر کی مورتیوں میں پھر سے جان پڑ جائے گی۔"

انجن نے باہر کی تاریکیوں، سناٹوں اور پنڈت جی کے علم و دانش کی روشنیوں کو جیسے بیک وقت للکارا اور اس کی چیخ و پکار میں پنڈت جی کی آواز پھر کہیں کھو گئی ــــ لیکن پنڈت جی جیسے اب انجن کی گستاخی سے جھلا اٹھے تھے انھوں نے بھی اپنی آواز بلند کی۔

"گنگا جی اس دنیا میں براجیں اور پتھر کی مورتیوں میں جان پڑ گئی ——
گنگا جل امرت ہے۔ گنگا جل کلیان ہی کا شبھ نام ہے۔"
چیتن بابو گنگا مائی آپ کی خود چل کر آ رہی ہے کلیان کے لیے اس سے
سیدھا اور راستہ نہیں ہے۔ چیتن بابو" پنڈت جی اپنی آواز میں اعتماد
پیدا کر رہے تھے۔
انجن فراٹے بھرتا ہوا گنگا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گنگا چیتن بابو کی طرف خود
چل کر آ رہی تھی۔
چیتن بابو کے دل میں ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ انجن فراٹے بھرتا ہوا۔
گنگا مائی کے سینے پر چل رہا تھا —— "گنگا مائی پیچھے چھوٹ رہی ہے چیتن بابو۔
سمے بیت رہا ہے۔"
چیتن بابو دیوانوں کی طرح اٹھے اور انھوں نے اپنے لختِ جگر کی لاش
گنگا میں پھینک دی۔
ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ منا ابھی برتھ پر نہیں تھا اور ننھے کی لاش نیچے
برتھ پر پڑی تھی۔

کینڈل کالونی

(مقام اور کردار سب کے سب قطعی فرضی ہیں اگر آپ چاہیں تو سامان کی فہرست اور لکھنے والے کو اصلی سمجھ سکتے ہیں)

اُس پیاسی اور بنجر دھرتی کی مانند جس پر بادل امڈ امڈ کر چھائے تھے لیکن تیز ہواؤں نے انھیں اڑا کر کہیں اور دور برسنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔

کوئی ان محبتوں کے لیے جو دوسروں سے اس کو نہیں ملتی ہیں ترس تو سکتا ہے۔ لیکن ابا کی ایک اور محرومی تھی۔

وہ آدمی جو اپنی ہی محبت بے دریغ دوسروں پر لٹانا چاہے۔ لیکن نہ لٹا سکے یہ ایسی محرومی ہے جو سناٹا بن کر آدمی کے دل میں بس جاتی ہے۔

یا یوں سمجھیے جیسے بادل امڈ امڈ کر اٹھتے ہوں جھوم جھوم کر چھاتے ہوں لیکن برس ہی نہ پاتے ہوں اور ان کے وسیع سینے میں چھپا ہوا ٹھنڈا میٹھا پانی کنکر پتھر بن کر ان کے اپنے سینے کا بوجھ بن جاتا ہو۔

"ابا" ساری کینڈل کالونی کا ابا تھا۔ میں نے کرایہ دار کے ناطے اس کی

اولادِ معنوی کے انبوہِ کثیر میں ایک ضلفے کی حیثیت رکھتا تھا۔ پہلے پہل جب مجھے ابا سے سابقہ پڑا تھا تو اس نے مجھے کانچ کے سامان کی دوکان سے اٹھائے ہوئے مٹی کے مادھو کی طرح برتا تھا مالکِ دوکان نے اگر کانچ کے سامان میں مجھے بھی سجا دیا تو میرا کیا دوش لیکن خریدار نے مجھے ہی قصور وار ٹھہرایا کہ میں اس دوکان کا اہل نہیں تھا۔۔۔ اور میرے اس جرم کی ابا نے مجھے خوب خوب سزا دی۔

میرا جرم یہی تھا کہ میں تلب شہر میں جہاں رہنے کی تمنا میں بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگ اپنی موٹروں کے ٹائر گھستے پھرتے تھے لیکن انھیں رہنے کو اس کالونی میں مکان نہیں ملتا تھا۔ وہاں میں موٹروں کے ٹائر نہیں اپنے جوتے گھستے پھر رہا تھا۔

ابا نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔

پھر پیر سے سر تک دیکھا۔

وہ بلا شرکت غیرے ساری کالونی کا مالک تھا۔ اولاد اس کے گنتی نہیں۔۔۔ چھوٹے بڑے خوبصورت سے کوارٹرس اور ان میں سجے ہوئے رنگ برنگے سامان کے درمیان کانچ کے بنے ہوئے نازک نازک سے لوگ۔۔۔ یہ سب ابا کے کرایہ دار جو موٹروں میں اڑتے تھے اور فرش پر جوتے پہن کر چلتے تھے کالونی کے اسی کار گہِ شیشہ گراں میں، اپنے مٹی کے گھروندے کا سارا اثاثہ لیے میں بھی چلا آیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو سکا جب کہ "ابا" نے مجھے الٹ پھیر کر اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہیں ہوں۔ مجھ میں کوئی کسر نہیں ہے گھر کے لیے میری ضرورت اور حاجت مندی یقیناً ایسی ہے کہ اس کالونی میں دو پورشن جو کہ میں کرتا پڑا لیے
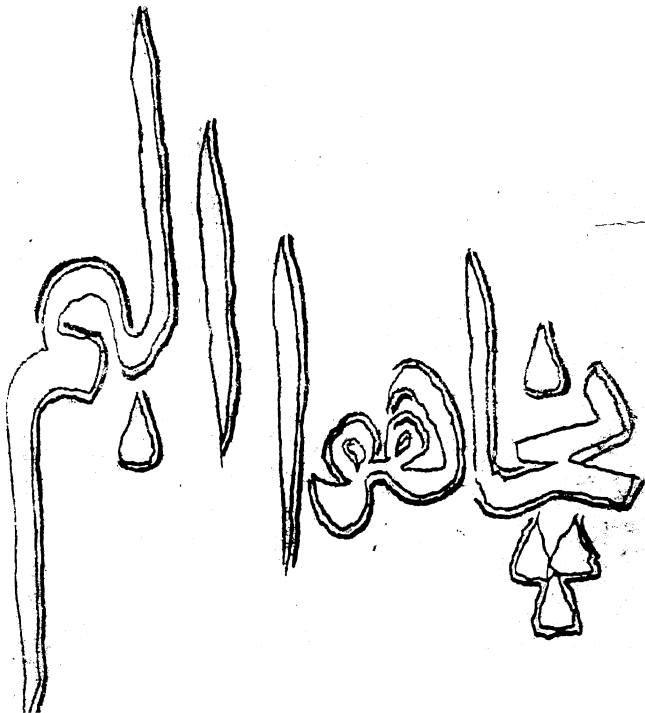
اور جیسے سبھوں نے چھوڑ دیا ہے، مجھے دے دیا جا سکتا ہے ـــــ مجھے "ابا" نے اس کے باوجود تین چکر کروائے اور جب میں نے مایوس ہو کر اس سے اس ضمن میں ملنا چھوڑ دیا تو وہ خود مجھے شہر کے پرانے بازار میں اپنی لمبی چوڑی قیمتی سی کار میں بیٹھا ہوا ملا ـــــ خود اس کے بلانے پر میں جب اس کے قریب پہونچا تو اس نے کہا۔

کیوں صاحب آپ کو گھر نہیں چاہیئے۔

مجھے ایسا لگا جیسے "ابا" سرمایہ کسی غریب شہر کو چھیڑ رہا ہو اس کی ٹوپی اچھال رہا ہو۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہ کہہ سکا کہ مولانا بلا ناغہ تین روز میں کوئی آپ کے دیدار کے لیے نہیں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ میں ایسی بات کس طرح کہہ سکتا تھا۔ لہذا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس باچھیں کھل کر رہ گئیں میری زندگی کی ایسی ضرورت پوری ہو رہی تھی جس ضرورت کا اندازہ باری تعالیٰ کو ہو ہی نہیں سکتا ـــــ وہ جو عرش و فرش پر، حجر و شجر پر، شیشہ و سنگ میں آب و آتش میں، خار مغیلاں سے گل تر تک، نوک خار میں بھی اور برگ گل میں بھی جہاں چاہے جس وقت چاہے رہ سکتا ہے تو اس کے لیے مکان کی قلت کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں اس لیے یہ مسئلہ تو صرف غریب بندوں ہی کے حصے میں آیا ہے جس کی نسبت آپ اسے رجوع بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لیے میں نے "ابا" کو ایسی محبت کی نظر سے دیکھا جس سے احسان مندی بھی نمایاں ہو رہی تھی ـــــ اس لیے کہ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر رہا تھا جس کا وعدہ باری تعالیٰ نے نہیں کیا ہے اس لیے کہ گھر کوئی رزق تو ہے نہیں۔

اب میں کینڈل کالونی میں خلا کے مسافر گگارن کی طرح اس انداز سے وارد ہوا جیسے فاتح زماں و مکاں ہوں۔ اس لیے کہ میں نے ابا کا دل جیت لیا تھا جس نے مجھے اپنی کالونی میں رہنے کے لیے ایک فلیٹ دیا ہے

کینڈل کالونی میں مجھ سے کم درجے کا کوئی شخص نہیں تھا۔ درجے کا تعین میں نے موٹر اور کتے سے کیا ہے۔ قریب قریب ہر رہنے والے کے پاس ایک موٹر اور ایک یا دو کتے ضرور رکھے۔ یہ کتے دن کو اپنے مالکوں کے خلاف کالونی میں کانفرنس کرتے اور رات کو اس ذہنی ریاضت سے تھک کر اس طرح سو رہتے جیسے جانتے ہوں کہ آپس ہی میں ایک کا مالک دوسرے کے مالک کے گھر نقب لگانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے خائف بھی ہے۔ کالونی کی تقسیم اور رہ پراپرٹی کے بٹوارے کے سلسلے میں یہ مخالفتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ایک کا مالک دوسرے کے مالک سے بڑی رات کو اندھیرے میں نہیں ملتا تھا۔ کتوں کو باہر کے کسی راہزن کا کھٹکا نہ تھا جو کبھی اپنی نیند خراب کر کے رکھوالی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ وہ جانتے تھے کہ کینڈل کالونی میں رہنے والے سارے کے سارے لوگ ان کے اپنے مالک ہی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور اگر ان میں کوئی ان بن ہو بھی جائے تو کتے اس جھگڑے فساد میں کوئی رول ادا کرنے کو نمک حرامی کرتے۔ اسی لیے ان میں بھی محبت اور پیار بھی بڑھ گیا تھا۔ مالکوں کی ہر کانفرنس کے بعد وہ اپنی کانفرنس میں اپنے مالکوں کے اعمال نیک دید کا نہ صرف جائزہ لیتے بلکہ انھیں ذہنوں میں رکارڈ بھی کر لیتے

کھتی کے ان سارے مالکوں کا "ابا" جیسے سرغنہ تھا۔ اس لیے بھی کہ اس کے پاس کتے بھی زیادہ تھے اور موٹریں بھی زیادہ تھیں اور فی الوقت تو وہ ساری کالونی کا جیسا کہ میں نے کہا تھا بلا شرکت غیرے مختار کل تھا۔

شروع شروع میں جب میں کینڈل کالونی کے رہنے والوں میں شامل ہوا تھا تو سمجھتا تھا کہ دوسرے سارے لوگ بھی میری طرح "ابا" کے صرف کرایہ دار ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ایرانی نژاد وہی حسین جو اپنی بیوی کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے اس بیوی کو جس کے جسم پر سفید چمڑی تو ہے لیکن گوشت نہیں ہے وہ "ابا" کا کرایہ دار ہے اور وہاں میرے فلیٹ سے بالکل متصل وہ سندھی عورت بھی جو اپنے تن و توش اور جسیم وتھرے بدن کے بل بوتے پر اپنے شوہر کو چھوڑ کے یہاں آئی تھی وہ بھی "ابا" کی کرایہ دار تھی اس عورت کا اکلوتا چھوٹا سا لڑکا بڑا پیارا سا تھا لیکن بے انتہا شریر تھی۔ وہ کینڈل کالونی کے سارے بچوں سے یکے بعد دیگرے دوستی بھی کرتا اور لڑتا جھگڑتا بھی اور جب اس کے خلاف کالونی کے بچوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو جاتا تو وہ دوسرے بچوں سے ہٹ کر اپنی ماں سے جا چمٹتا اور بین کر کے کینڈل کالونی کے سارے بچوں کی شکایتیں کرتا، پہلوان قسم کی سندھی عورت پہلے دو مختصر اسی کی پیٹھ پر جھاڑ دیتی پھر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے فلیٹ سے نکل کر ایک ایک بچے سے لڑتی، بچوں کی ماؤں سے الجھتی بات بات پر اپنے بچے کے اکلوتے ہونے کا ذکر کچھ اس طرح کرتی جیسے یہ اس کی بدنصیبی نہیں بلکہ کوئی ناقابل انکار کارنامہ ہے جو اس نے صرف ایک بچہ جنا اور پھر اپنے شوہر کو چھوڑ رہے پکارنے لگی۔

"تمھارے دو ہیں ــــ میرا تو ایک ہی ہے۔"

"تمھارے تین ہیں ــــ میرا تو ایک ہی ہے۔"

"تمھارے کتنے سارے ہیں ــــ میرا تو ایک ہی ہے۔"

ایک انسپکٹر کی بیوی نے جو اس کالونی میں موٹر کی بجائے موٹر سیکل پر ہی اکتفا کرتا تھا سندھی عورت سے ایک دن کہا۔

بہن جی ــــ تمھارا ایک ہی ہے تو دوسرا جھٹکے سے پیدا کیوں نہیں کر لیتیں۔ کالونی بھر میں چیختی پھرتی ہو میرا ایک ہی ہے۔ مجھے تو ایک ہی ہے۔ تم کہو تو اپنے شوہر کو خدمت کے لیے حاضر کر دوں۔

وہ تو خیر گذری جو سندھی عورت نے بات نہیں سمجھی ورنہ انسپکٹر کی بیوی بیچاری تو یوں بھی جلتی کپاس تھی ہوا کس میں ڈولتی تھی اور وہ بھی اس طرح جیسے پتنگ تھاپ کھائی ہو، سندھی عورت کے انتقاماً دو چار بوسے بھی اس کی جان لینے کے لیے کافی تھے لیکن سندھی عورت نے یہ بات سنی نہیں یا پھر سن کر سمجھی نہیں۔

کینٹڈل کالونی کی ایک اور مشہور شخصیت جو ساری کالونی کے ذہنوں میں رات کی گہری تاریکی کے ساتھ ساتھ ابھرتی تھی اور پو پھٹتے سمے اجالوں کے ساتھ محو ہو جاتی تھی وہ انسپکٹر کے چھوٹے بھائی کی ہستی تھی، یہ ایک معمولی سا لونڈا تھا جو بابا کا قریبی رشتہ دار ہونے کے ناطے ساری کالونی کا رشتہ دار تھا لیکن بغیر کسی اجازت کے ہر گھر میں بلا جھجک داخل نہیں ہو سکتا تھا ــــ سندھی عورت، ایرانی غلام حسین، دودھ والے غفورے میاں اور مجھ سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ویسے ساری کینٹڈل کالونی سے اس کا ناطہ یقینی تھا، یہ لڑکا ہندوستان بھر میں پھر کر گھاٹ گھاٹ کا

پانی پیتا رہتا لیکن روٹی کے انتظام کے لیے کینٹ کالونی ہر دوسرے تیسرے مہینے ضرور آتا اور اندھیرے کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر چھا جاتا۔ کینٹل کالونی کا ہر گھر اس کا کفیل ہوتا اور وہ اس طرح کہ وہ اسی کالونی میں وقفے وقفے سے ہر گھر میں ہاتھ صاف کرتا رہتا مال مسروقہ کی قیمت کا لحاظ کرتے اس کی سیاحی کی مدت مقرر ہوتی۔ کینٹل کالونی سے قدم باہر نکال کر جب اس نے قرب وجوار میں بھی اپنی ہاتھ کی صفائی کی مشق کا آغاز کیا تو انسپکٹر بیچارہ سرکاری وردی سے سرکاری پسٹل نکال کر سرکاری جوتوں سمیت اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اپنے فرض کی ادائی میں بھائی ہونے پر بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور اسے اچھی طرح تنبیہہ کر دی کہ جو کچھ کرنا ہو بس کینٹل کالونی ہی میں کیا کرے۔ اس لیے کہ کالونی کا ہر گھر اس کا اپنا گھر ہے وہاں کے رہنے والے اس کے اپنے لوگ ہیں ان کی ہر چیز اس کی اپنی ہے۔ خدا معلوم اس لونڈے کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا کہ میں بھی کینٹل کالونی کے مالک کو جو ساری کالونی کا "ابا" ہے "ابا" ہی پکارنے لگا ہوں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میرے گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھا اور ان دنوں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دورے پر کسی ضلع کو گیا ہوا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے کے ایک روشن دان سے داخل ہو کر جو بھی اسے مل سکتا تھا اٹھا لے گیا۔ اس مسروقہ سامان کی فہرست میں نیچے اس لیے درج کر رہا ہوں کہ اگر آپ یہ سامان برآمد کرنے کے لیے آمادہ ہوں تو سب کا سب میں آپ کی نذر کر دوں۔ میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ اس لونڈے کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دے دوں سامان اس سے آپ اگلوا لیں اور خوشی سے اپنے گھر میں محفوظ رکھیں اور یہ کام آپ بہت آسانی

سے کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کا گھر یا فلیٹ کینٹرل کالونی میں نہ ہو اور آپ "ابا" کے رشتہ دار نہ ہوں۔ اور یہ لونڈا اسی رشتے داری کے سہارے ہمیشہ بخشا گیا ہے۔

سامان کی فہرست یہ ہے۔

ایک کن ریلے، جرمن ٹیبل کلاک، ایک ایگل تھرموس۔

ایک پاندان جرمن سلور، ایک عطر دان، ایک کافی سیٹ، ای۔ پی۔ این۔ ایس ایک گاگل، ایک نمبری عینک، ۲ پتلون، ۳ شرٹ، ایک انڈین پائلٹ فونٹن پن۔ الشجاع کے تین اور جائزے ونقش کے دو دو پرچے، داستان گو کا کہانی نمبر اور ادب لطیف کا سالنامہ، ایک اردو کتاب، باپ بیٹے (ترگینف) ایک انگریزی کتاب یا مادی ہل ہول (الگزنڈرا کوپرن) گیارہ سگریٹ کی ڈبیاں جن چھ خالی ہیں، سوڈے کے تین شیشے جن میں ایک بھرا ہوا تھا۔ سولن وہسکی کا ایک نپ جو میں نے پینے کے لیے نہیں تفریحاً رکھا تھا اور بھی کچھ ہوگا جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔

دودھ والے غفورے میاں کے متعلق تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں، مڑے ہوئے سینگوں کی چکنی چپڑی سیروں دودھ دینے والی کئی بھینسیں غفورے میاں کا کاروبار بڑھانے کے لیے خود تشہیر کا باعث تھیں۔ لوگ ان بھینسوں کو دیکھ کر ہی ان کے دودھ کا تصور کر لیتے اور ان کی نظروں میں ملائی اور مکھن سے بھری تھالیں سما جاتیں۔ غفورے میاں بڑی احتیاط اور اہتمام سے دودھ گاہکوں کے سامنے ہی دوہتا اور اس کا یہ ہنر کوئی دیکھ بھی نہ پاتا کہ اپنی کمر کے

گرد لیٹے ہوئے سائیکل کے ٹیوب سے جو پانی سے بھرا ہوتا ربڑ کی نالی لگا کر وہ کس طرح دودھ میں میٹھا اور شفاف پانی ملا دیتا ہے۔

انسپکٹر کے فلیٹ کے نچلے حصے میں دو بوڑھیاں بڑی کس مپرسی کے عالم میں رہتی ہیں یہ "ابا" کے مرحوم بھائیوں کی نشانیاں ہیں جنھوں نے کبھی اچھے دن ضرور دیکھے ہوں گے لیکن اجالے سے اندھیرا جس طرح بھاگتا ہے آج کل ان بوڑھیوں کے اچھے دن اسی طرح ان سے بھاگتے رہتے ہیں دراصل بھری پری کینٹل کالونی کی دنیا میں جہاں موٹروں کی چکا چوند ہے یہ دونوں بوڑھیاں اپنی تین چار بطوں، چار چھ مرغیوں اور ایک سیاہ بکری کے پیچھے صبح سے شام تک بڑے خشوع و خضوع سے اس طرح مصروف رہتی ہیں جیسے جانتی ہوں کہ کینٹل کالونی کے سارے افرادِ خاندان انھیں بطوں اور مرغیوں کے سہارے چمکتی موٹروں تک پہونچے ہیں ـــــ یہ دونوں بوڑھیاں انسانوں کی بستی میں روحیں معلوم ہوتی ہیں جو اپنا ماضی ڈھونڈھتی پھر رہی ہوں۔

"ابا" نے غفور میاں کے پاس ایک بھینس خرید کر چھوڑ رکھی ہے وہ معاوضے میں روزانہ تین پاؤ دودھ "ابا" کو دیتا ہے اور نصف سیر دودھ کا "ابا" نے ان بوڑھیوں کے لیے بندوبست کر دیا ہے ایک دوسرے کی نظر بچا کر یہ بوڑھیاں کبھی کبھی اپنے حصے سے زیادہ دودھ لی جاتی ہیں اور پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی کے مرحوم شوہران کی اپنی قبروں سے اٹھائے جاتے ہیں پھر سلائے جاتے ہیں پھر اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر دونوں ہی مل کر رونے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے دن دودھ کا راتب ملنے سے پہلے دونوں شیر و شکر

ہو چکی ہوتی ہیں اور ابا کے دودھ میں سے پاؤ بھر دودھ نکال کر اتنا ہی پانی ملا دیتی تھیں۔
میرے فلیٹ کے بائیں ابا کا ایک اور قریبی رشتہ دار میجر رشید الدین خاں
رہتا ہے یہ غالباً "ابا" کے کسی مرحوم بھائی کی چہیتی بیٹی کا چہیتا شوہر ہونے
کے ناطے "ابا" کو بھی پیارا ہے۔
ابا کو ویسے کالونی کا ہر فرد پیارا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالونی
کسی بھی فرد کو "ابا" کے پیار اور محبت کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی
ضرورت انہیں ہے وہ ابا جانتا ہے لیکن "ابا" اصولوں کا آدمی ہے وہ وقت
کے انتظار میں ہے تاکہ ان لوگوں کو وہ ساری چیزیں دیدے جن کی قیمت ان
کی نظروں میں ابا کے پیار سے کہیں زیادہ ہے۔
میں تو آپ کو میجر رشید الدین خاں کے متعلق بتلا رہا تھا کہ ابا بیچ میں آ دھمکا
"ابا" کی شخصیت ہی کچھ ایسی من موہنی ہے کہ آپ کینٹرل کالونی کا ذکر کریں تو
اس کالونی کے چپّے چپّے پر ابا چھایا ہوا نظر آئے گا۔ گھر گھر میں ابا کی پرچھائیں
دکھائی دے گی "ابا" کی جو مرکزیت ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے کہ ابا کے وجود
کو کینٹرل کالونی سے ہٹا لیجیے تو اس ساری کالونی کے یقیناً پرخچے اڑ جائیں گے
اس کالونی کے حدود میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی صورت بھی نہیں
پہچانے گا۔ کاغذ قلم اور برچھے بھالے لے کر لوگ کالونی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
اس کا بٹوارہ کر لینے کے لیے کبھی ایک دوسرے پر جھپٹیں گے، کبھی عدالت کا دروازہ
کھٹکھٹائیں گے۔ عدالت کے دروازے کی مماثلت سے ہی میں نے اس
ہنگامہ آرائی کی فضا میں کاغذ اور قلم کا بھی نام لیا ہے ورنہ کاغذ اور قلم کا یہاں

کیا کام ۔ میں کہنا کیا چاہتا تھا کہ ابا کا وجود ہٹ جائے تو پھر اس افراتفری اس بغض و عناد اس آتش دیار درست کی فضا میں جہاں بھائی بھائی کو دیکھ کر منھ پھیر لیتا ہے ۔ جہاں خاندان کی بڑی بوڑھیاں کھنڈروں سے آئی ہوئی روحوں کی طرح اپنا ماضی تلاش کرتی پھرتی ہیں وہاں آدمی آدمی کو کس طرح پہچان سکتا ہے اور میرے کان آنے والے وقت کے وہ دھماکے سن رہے ہیں جب کینٹرل کالونی بالکل جوں کی توں دھری رہے گی لیکن وہ حرارت اس سے چھن جائے گی جو زندگی کا دوسرا نام ہے اس میں پارک ہونے والی موٹریں اپنے اپنے لیمپ جلا کر ایک دوسرے کو گھوریں گی لیکن پہچان نہ پائیں گی کالونی کے کتے ایک جگہ جمع ہو کر کانفرنس کریں گے اور جب انھیں موت کے سے سناٹے ساری کالونی میں رینگتے ہوئے نظر آئیں گے تو وہ انھیں سناٹوں سے بھوں بھوں کرتے زندگی کی بھیک مانگیں گے ابھی میری کینٹرل کالونی کے "آدی باسیوں" کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ایک "محبت" کی موت ایک "معاشرے" کی موت ہوتی ہے اور اسی موت و زندگی کے درمیان ابا کا وجود آج تک ایک ربط باہمی بنا ہوا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساری کالونی کے "آدی باسی" کسی گہری گھاٹی کے اٹوٹ اندھیروں میں کالونی سمیت ڈوب جانے کے لیے اپنا سارا زور بازو لگا رہے ہوں صرف اس تصور میں کہ اس کھائی کی تہہ میں جواہرات کی ڈھیریاں چھپی ہیں اور ابا بے چارہ تن تنہا ساری کینٹرل کالونی کو ایک مضبوط رسی میں باندھے کھائی کے کنارے کھڑا ہوا کالونی کو اوپر اٹھانے کے لیے آخری بار اپنا سارا زور اپنی ساری قوت لگا رہا ہے لیکن

رسی ٹوٹ جانے کا ڈر ہے ـــ مجھے ایک ڈر اور بھی ہے رسی ٹوٹنے سے پہلے ہی
اگر ابا کا سانس ٹوٹ جائے تو۔ اس لیے کہ وہ تن تنہا کنارے پر کھڑا ہانپ رہا
ہے اور اس کے دست بازو شل ہو گئے ہیں۔ میں پھر کہاں سے کہاں نکل آیا
ہوں۔ میں تو آپ سے میجر رشید الدین خاں کی بات کرنے چلا تھا میجر رشید الدین
خاں کالونی بھر میں سب سے مقبول ہے مرنجان مرنج شخصیت کا مالک ہے آپ
اس سے سوائے ادب کے کسی بھی عام موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔ وہ آج
کل مختلف قسم کا بزنس کرتا ہے آدمی تیز ہے زمانے کے سرد و گرم کا شعور
رکھتا ہے کالونی کی پراپرٹی پر اپنے تمول کی بنیادیں نہیں رکھتا۔ پولیس ایکشن
کے بعد اس کو حیدر آباد آرمی سے علاحدہ کر دیا گیا تھا لیکن آج فوجی افسر کی
کوئی نشانی اس میں باقی نہیں ہے۔ میں نے اتنا وسیع الملاقات آدمی
کم ہی دیکھا ہے بھانت بھانت کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے ہیں کسی
کے ملنے جلنے والوں کو دیکھ کر اس کی اپنی انفرادیت کے تعلق سے کوئی رائے
قائم کی جا سکتی ہے لیکن رشید الدین خاں کا معاملہ ہی دوسرا ہے اس لیے کہ
اس کے پاس دوست اور راہل معاملہ کچھ ایک ہی ڈھب سے آتے ہیں تالی بجتی ہے
اور میجر کھڑکی سے سر نکال لیتا ہے ایک بار ایک رکشہ میں ماہی بے آب کی طرح
تڑپتی ہوئی ایک عورت میجر کے پاس لائی گئی تو میں حیران ہو گیا لیکن کچھ ہی دیر
بعد میں نے دیکھا کہ میجر چھری ہاتھ میں لیے سورج کی جانب رخ کیے آنکھیں بند
کیے جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہا ہے اور چھری پر پھونک مار کر نہایت احتیاط سے
عورت کے ننگے پیٹ پر چلیپے بنا رہا تھا جو بن نہیں رہے ہیں اس لیے کہ عورت

کا پیٹ کوئی کاغذ نہیں ہے اور میجر کی چھری بھی کوئی قلم نہیں ہے۔ لیکن وہ جوں جوں ایسا کرتا جا رہا ہے عورت کی تڑپ سکون سے بدل رہی ہے۔

میجر رشیدالدین نے دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جو زندگی گزاری ہے اس کی داستان جتنی طویل ہے اتنی ہی دردناک بھی ہے۔ فی الوقت اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ میجر رشیدالدین خان جس کے چہرے کو دوسری جنگ عظیم نے مسخ کر رکھا ہے موت سے اس طرح آنکھیں ملاتا رہا ہے کہ موت ہمیشہ اس کے آگے خجل خجل رہی ہے۔

کینٹرل کالونی کی خصوصیات کو آپ کے سامنے رکھنا میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ ہے اس کالونی میں مجھے قدم قدم پر محبتیں ملی ہیں چھوٹوں سے بڑوں سے ہم عمروں سے لیکن اس کے باوجود ان محبتوں کو محبت کہتے میں ڈرتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کینٹرل کالونی میں ساری محبت کی عمر بھی ایک ساعت دیدار سے کم ہوتی ہے جب کہ ایک ساعت دیدار اسی جہاں میں ساری عمر کی محبت ہو سکتی ہے لیکن میں ان مختصر ترین محبتوں کو طول دینے کا گر جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان محبتوں میں اگر کوئی شے حائل ہے تو کینٹرل کالونی خود ہے اپنی مشترکہ جائداد کی صورت میں یہ کالونی یہاں بسنے والے افرادِ خاندان کے دلوں میں ایسے انجکشن لگا رہی ہے جن سے محبتوں کے نشے اتر جاتے ہیں آدمی کے اندر ڈھکے چھپے ایسے جذبے بیدار ہو رہے ہیں جو محبت کی عمر کو گھٹاتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ بڑے سلیقے سے قتل کر دیتے ہیں۔

ابا کا ایک چھوٹا بھائی ہے جسے کالونی کے اکثر لوگ چچا پکارتے ہیں ابا کے اور اس چچا کے درمیان کینڈل کالونی سب سے زیادہ حائل ہے ابا جس سمت دیکھتا ہے چچا اس سمت دیکھتا ہی نہیں اس لیے کہ اس مرکز پر جنھیں دونوں ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں دونوں کی نظریں جا ملتی ہیں لیکن چچا کی بیوی جسے کالونی کے سارے لوگ چچی نہیں پکارتے بڑی ہی سمجھ دار اور وضعدار عورت ہے "ابا" اور "چچا" کی مخالفتوں کے باوجود وہ بزرگ ہونے کے ناطے ابا کا بڑا احترام کرتی ہے۔ مجھے اس کالونی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ایک خوبصورت سے خوان میں ہر شے کو سجا کر ابا کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ اس سجاوٹ کے پیچھے ابا کی نظر نہ جا سکیں۔ چچا کی بیوی جسے سب چچی نہیں کہتے کچھ اسی قسم کا رول دوسروں سے زیادہ ہی ابا سے ادا کرتی ہے۔

چچی کی بیٹی کا حسن کالونی کے باہر بھی دور دور مشہور رہے۔ اس شہرت میں سچ پوچھیے تو چچی کی بیٹی کے حسن کو دخل کم ہے اور شخصیت کو زیادہ بعض شخصیتیں کچھ اس طرح جاذب توجہ ہوتی ہیں کہ انھیں دیکھتے رہنے میں آنکھوں کو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو ان میں وہ کشش ان کی غیر معمولی حسن کی بنا پر نہیں ہوتی جب کہ وہ اتنی حسین ہوں ہی نہیں سکتی چچی کی اس بیٹی کا حسن اس کی وضعداری اور پندار کے باعث نکھرتا ہے وہ نظریں جو دنیا بھر کو دیکھ لینے کا جتن کرتی ہوں لیکن اپنی "دو نگہ" کو بقولِ غالب "بظاہر نگاہ" بننے نہیں دیتیں ـــ کالونی کی یہ حسینہ دلنواز کالونی کے ابا اور کالونی کے چچا یعنی اس کے اپنے ابا اور اس کے اپنے چچا کے نفاق کو بھی اسی نگاہ غلط انداز سے دیکھا کرتی ہے جیسے راہ میں پڑے طالب دیدار کو۔

"ابا" کے وہ دن سنہرے دن تھے جن دنوں "ابا" کی چہیتی بیوی زندہ تھیں ابا کو اس ایک ہستی میں دنیا بھر کی محبتیں مل گئی تھیں۔ اس معمولی شکل وصورت کی عورت نے واقعی کالونی بھر کے دلوں پر حکومت کی تھی ابا تو ظاہر ہے ایسے میں فاتح زمانہ تھا جس نے اس عورت کا دل جیت لیا تھا جس کے قبضے میں اس کے ہر چھوٹے بڑے ملنے والے کا دل تھا۔ لیکن جب اس عورت نے زندگی ہی سے ناطہ توڑ لیا تو اس کے بے پناہ ایثار ومحبت نے "ابا" کے ویران دل میں محرومیوں کی ایک دنیا آباد کر دی ــــ اور اب ابا ہر چھوٹی محبت کے پیچھے آنکھیں بند کیے دیوانہ وار دوڑتا نظر آتا ہے اور وہ ساری محبتیں جو کینٹڈل کالونی کی سونا اگلنے والی جائیداد کے سہارے آج تک جوں توں زندہ تھیں بیمار ہو کر آخری سانسیں لے رہی ہیں تو "ابا" بوکھلا گیا ہے وہ کالونی کے سناٹوں میں پازیب کی جھنکاروں کو سننا چاہتا ہے وہ ویرانیوں میں زندگی کی ہماہمی کا متلاشی ہے وہ کینٹڈل کالونی میں ایک ایسا دیا جلائے بیٹھا ہے جس کی جوت کالونی کے ہر رہنے والے کو دوسرے رہنے والے کے دل کا راستہ بتا سکے۔ لیکن لوگ اس جوت کے سہارے ایک دوسرے کے دل میں داخل ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے دل سے نکل کر کالونی ہی میں جمع ہو رہے ہیں۔

جب کبھی ابا یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس نے جو دیا جلا رکھا ہے اس کی لو، اتنے سارے کالونی کے رہنے والوں کی یورش سے کانپ کانپ اٹھتی ہے تو وہ ان سبھوں کو ساتھ لے کر کینٹڈل کالونی ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے سیر وتفریح کیلیے نئے نئے دل کش مقامات پر ان سب کو لے جاتا ہے بے دریغ خرچ کرتا ہے

ہنسی خوشی مسکراہٹیں، قہقہے، ترنگ، ولولے، غل غپاڑہ، کھیل تماشے ــــ کالونی کا چھوٹا بڑا ہر شخص جب اس کے اطراف خوش اور مطمئن ہوتا ہے تو ابا کے چہرے کا روپ دیدنی ہوتا ہے وہ سراپا ایک دیا بن جاتا ہے جس کی بتی تیل کے آخری قطرے کے سہارے جل رہی ہو۔ لیکن اپنی اس پل بھر کی روشن زندگی سے مطمئن ہو جس کے اطراف پروانے رقصاں ہوں۔

"ابا کے بعد کینڈل کالونی کا جو کچھ ہوگا وہ تو میری نظر میں ہے
لیکن "ابا" کے بعد اس ابا کا کیا ہوگا جو کبھی نہیں مرے گا۔"

ایک روز میرا بدن شدید تپ سے پھنک رہا تھا ان دنوں گرمیاں شدید پڑ رہی تھیں۔ ابا میری عیادت کو آیا اپنے ایر کنڈیشنڈ روم سے نکل کر سیدھے فلیٹ. آتے آتے اس کا چہرہ تمازت سے دہک اٹھا تھا۔ اس نے خیر خیریت پوچھی اور میرے پاس بیٹھ گیا تو میں نے پنکھا اس کے ہاتھ میں تھما دیا کہ وہ شدید گرمی کو نہیں۔ گرمی کے احساس کو دور کر سکے۔

کہنے لگا یہ فلیٹ تو بھٹی کی طرح تپتا ہے اس فضا میں بھلا تم کیا تندرست ہو سکو گے۔

میں نے از راہِ مذاق کہہ دیا آپ ہی کا تو فلیٹ ہے ایک بجلی کا پنکھا یہاں بھی لگوا دیجیے نا ــــ ساری کالونی میں میرا ہی ایک فلیٹ ہے جو پنکھے سے محروم ہے۔

شام کو اس کا موٹر فلیٹ کے سامنے رکا تو وہ خود ٹیبل فین اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

اور کچھ ایسی پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے پنکھا میرے

فلیٹ میں نہیں بلکہ اسمگل کیا ہوا مال سرحد پار پہونچا رہا ہو۔
لوٹنے لگا تو بڑی لجاجت سے مجھ سے کہنے لگا ___ کسی سے بتانا مت کہ یہ پنکھا میں نے تمھیں دلایا ہے ۔
کیوں نہیں بتاؤں گا ___ یہ تو آپ کی عنایت ہے ؛؛ میں نے اصرار کیا۔
"میرے لوگ برا مانتے ہیں ___" وہ مسکرایا ___ پنکھے پر صرف کی ہوئی رقم محفوظ رکھی جاتی تو میرے بعد کل تقسیم میں انھیں کے کام آتی ۔
سمجھے کچھ"

اندھیروں کی لاج

بخت افروز جہاں ساری بیگموں کی سرتاج تھیں۔ زمانے نے انھیں اور
انھوں نے زمانے کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا۔ جب ان کے بہار کے دن تھے تو
سارے شہر میں ان کا نام چلتا تھا۔ مزاج اتنی تھیں کہ بڑے بڑے نواب زادوں
سے ذرا سی بات پہ چشمکیں ہو جاتیں۔ بگڑ جاتیں تو منانے والے سو سو طرح سے مناتے
لیتا
اللہ میاں نے صورت دی تھی۔ آواز دی تھی اور پھر بڑی بات یہ کہ ترکے میں دو
بھی خدا نے دی تھی۔ کسبیاں یوں تو شہر میں بہت سی تھیں۔ لیکن بخت افروز جہاں
جی لی طوائفوں میں بھی سمجھیے کہ ماؤنٹ ایورسٹ تھیں جن کو کسی تین سنگھ یا لاری
نے فتح نہیں کیا تھا۔

نواب اور نواب زادے افروز جہاں اور فیروز جہاں کے طائفے کی باتیں ہو
بڑے تکبر سے کرتے۔ افروز جہاں اور فیروز جہاں دونوں بہنیں تھیں لیکن افروز جہاں

کی بات ہی کچھ اور تھی۔ افروزجہاں سے اپنے معاشقے کی داستانیں سناتے پھرنا ——
اہل ثروت کے لیے باعث فخر تھا۔ جہاں نواب زادوں نے افروزجہاں کے نام کے
ساتھ تھوڑی بہت شہرت پائی تھی۔ ان کا متمول ہونا مسلم تھا وہ خود اس بات
پہ اتراتے تھے کہ شہر کی سب سے بڑی طوائف کے خلوت کدہ کو انھوں نے اپنی بھری
جوانی کی دولت سے مزین و آراستہ کیا تھا۔

وہ ایک جن کی زیادہ شہرت تھی ان کا عالم تو یہ تھا کہ کوٹھوں سے گزرتے وقت
نظر اٹھا کر کسی دوسری حسینہ کی طرف دیکھ لینا بھی خلافِ شان سمجھتے تھے بستی بھر
میں نظریں اٹھتیں آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے۔ پھر انگشت نمائی بھی ہوتی۔ آج کل
افروزجہاں نواب صاحب پر بہت مہربان ہیں خدا خیر کرے —— بھئی افروزجہاں
کے نام لیوا ہیں —— لکھو پتی تو ہوں گے ہی لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ چیک بک
کے لیے آنکھیں ترس جائیں گی صاحبزادے کی —— یار قسمت والا نکلا لونڈا سنتے
ہیں اسلئے نوازتی ہے —— واہ صاحب کس نے کہہ دیا یہ —— اس کو بھلا کیا نوازے
گی۔ ابن فلاں ہے ابن فلاں —— اور پھر جوانی بھی کیا نکالی ہے —— افروز کی
بیٹی ہوتی تو جوڑ تھا اس سے —— عمر کا تفاوت بھی تو ایک چیز ہے —— بس
فدا ہو گئی ہوں گی افروزجہاں بھی —— کمسن ہے۔ جاہ و ثروت کی کمی نہیں ہے
—— ابن فلاں ہے۔ ابن فلاں۔

لیکن افروزجہاں بھی لاکھوں میں ایک سمجھی جاتی تھیں —— لاکھوں میں ایک
نکلیں بھی —— لکھ پتی سیٹھ ابن فلاں کو چھوڑ چھاڑ کر وہ بس ایک مفلس شاعر کی
ہو رہیں —— اور یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ سارے عاشق بس دیکھتے کے دیکھتے

رہ گئے ـــــ
راتوں کو افروزجہاں کے کوٹھے کا طواف کرنے والوں نے شاعر کے گنج قفس کو کھوج نکالا ۔ لیکن افروز جہاں بھی پانی کی عورت تھیں ـــــ بے پردگی گوارا نہ کی ـــــ کہلا بھیجا کہ جس افروز کے لیے آپ یہاں آئے ہیں، اس کو میں نے اپنے ہاتھوں "مہندی محبوب" میں دفنا دیا ہے ـــــ اور جو بخت افروز جہاں اس چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے اس کے پاس اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے اب اس کا سب کچھ ملک کے مشہور شاعر تسکین سرمدی کی ملکیت ہے ـــــ اللہ بس باقی ہوس ـــــ

افروز جہاں سے ملنے والوں میں ہر درجہ کا عاشق تھا. ایسا عاشق بھی تھا جو بس تعلقات نبھا رہا تھا ۔ افروز جہاں گھر بیٹھ گئیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا ۔ اور وقتاً فوقتاً آتا ہوا ہر کو ٹھے کی چوکھٹ پھلانگنے لگا ۔ ایسا عاشق بھی تھا جو کسی صنو جان کو حالت نشہ میں "افروزی" پکار کر ہی خوش ہو جاتا ۔

ایک عاشق نے افروز کی یاد میں فیروزہ پر قناعت کر لی ـــــ لیکن فلاں ابن فلاں نے مشہور شاعر تسکین سرمدی کے گھر کا طواف نہ چھوڑا، اور ایک رات جب کہ شاعر دولت داد و تحسین سے مالا مال ہو کر بڑی رات کو ایک مشاعرے سے لوٹ رہا تھا عین گھر کے قریب لوگوں نے ایک دلدوز چیخ سنی ـــــ چیخ سننے والے جب شاعر کے گھر کے قریب پہونچے تو انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ خون آلود لاش سے چمٹی ہوئی افروز جہاں گلی میں لوٹ رہی ہے ۔ اس کے دونوں ہاتھ، اس کا چہرہ، اس کے بال خون میں رنگ گئے ہیں ـــــ وہ عالم نیم بیہوشی میں مسلسل

ٹمٹما رہی ہے ـــــ اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیوانوں کی طرح غور سے دیکھ دیکھ کر چوم رہی تھی ـــــ یہ تمھارا خون ہے ـــــ تم بہت بلند ہو۔
ـــــ تم عظیم ہو ـــــ یہ تمھارا خون ہے۔
افروز جہاں بے ہوش ہو گئی ـــــ

شاعر کو کس نے قتل کر دیا، یہ راز آج تک راز ہی ہے ـــــ نواب صاحب بھی کچھ کم غمزدہ نہ رہے۔ کیوں کہ شاعر ان کا بھی دوست تھا ـــــ یہ اور بات ہے کہ پولیس کے چند افسروں سے نواب صاحب کی تخلیے میں ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب نواب صاحب کچھ کم ہی مسکرا سکے، پھر یکایک وہ بہت خوش رہنے لگے۔ ان کے چار ایسے مصاحب جو ہمیشہ نواب صاحب کی پیشی میں رہتے تھے آہستہ آہستہ پھر ڈیوڑھی میں آنے لگے جو کچھ دنوں سے پتہ نہیں کہاں غائب تھے۔

اللہ رکھے نواب صاحب کی ڈیوڑھی کی چہل پہل، ڈیوڑھی کی عظمت، ڈیوڑھی کی زندگی سب کچھ نواب صاحب ہی کے دم قدم سے تھی ـــــ شاعر کے قتل کے بعد وہ کیا اداس ہوئے کہ ساری ڈیوڑھی پر اداسیاں مسلط ہو گئیں ـــــ اب وہ مسکرا رہے تھے تو ساری ڈیوڑھی کھلکھلا رہی تھی۔

شہزادی بیگم بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ اطلس کو ٹاٹ کا پیوند تو لگانہ تھا جو نواب صاحب دوسری بیگموں کی طرح شہزادی کو بھی اس طرح نظروں سے گرا دیتے جس طرح وہ دل سے دور ہو گئی تھیں دل کی بات اور تھی دل ہی تھا، اور وہ بھی نواب صاحب کا ـــــ اس نگری میں، اس بستی میں جو بس جاتا۔ بس

جاتا۔ اور جس کے لیے اس نگری کے دروازے بند ہو جاتے تو پھر نہ کھلتے ــــ لیکن شہزادی بیگم کو دل سے دور کرنے کے بعد ان سے نظریں بھی پھیر لینا نواب صاحب کے بس کی بات نہ تھی حالاں کہ وہ دل ہی دل میں شہزادی بیگم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ لیکن شہزادی نہ صرف نواب صاحب کی پہلی بیوی ہی تھیں بلکہ اسی گھر کی بیٹی بھی تھیں ــــ باجے، بارات جلوے مانجے سے آئی تھیں۔ دوسری بیگموں کا نواب صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا تو وہ مسند پر آ بیٹھیں۔ ہاتھ چھوڑ دیا تو بھی ہولی مسندوں کو لپیٹ سمیٹ کر نہایت احتیاط سے ہر ایک نے اپنے دل کے نہاں خانے میں انھیں چھپا رکھا ــــ

شہزادی کا ہاتھ نہ تو نواب صاحب نے تھاما تھا اور نہ ان کے بس میں تھا کہ اس ہاتھ کو بے دردی سے جھٹک دیتے۔ مرحوم نواب برکت جنگ نے بہو کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ میں دے کر جنم جنم کے لیے شیر و شکر رہنے کی قسمیں دی تھیں کیوں کہ بہو شہزادی ان کے بہت چہیتے مرحوم بھائی نواب صلابت علی خاں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نواب صلابت علی خاں تھے بھی بڑے خوبیوں کے مالک۔ خاندان بھر میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو ان کا شاکی ہو۔ سب ان کی تعریفیں کرتے ــــ بہت منکسر المزاج، خلیق الطبع مرنجان مرنج۔ ہمیشہ پان کی خوشبودار پیک سے باچھیں سرخیوں میں بھیگی رہتیں۔ کبھی کسی نے چیں بہ جبیں نہیں دیکھا ــــ اور موت بھی تو کس قدر اندوہناک تھی ان کی۔ برکت جنگ مرحوم کے دل پر جیسے بجلی گر گئی تھی۔ جب مسقط بن مبروک داروغہ اصطبل نے گھوڑے پر آ کر خبر دی کہ صلابت جنگ نہ رہے ــــ اور جب

وہ مرے ہیں اس وقت صلابت جنگ بھی کہاں تھے وہ صرف نواب صلابت علی خاں تھے۔ بعد میں برکت جنگ کو معلوم ہوا تھا کہ حاکم وقت نے جنگ کے خطاب سے انھیں سرفراز کیا تھا۔

اپنی زندگی میں نواب صلابت علی خاں نے یہ خوش خبری بھی نہ سنی تھیں کتنی خواہش تھی کہ وہ بڑے بھائی کی طرح جنگ کے خطاب سے نوازے جائیں اور باپ دادا کا نام روشن کرنے میں ان کا بھی حصہ رہے لیکن محروم میاں ان کا مقدر تھیں۔ ڈاڑھی اور سفید بالوں پر خضاب چڑھا کر واقعی جوان معلوم ہوتے، صحت بھی خاصی تھی۔ خدا بھلا کرے اس حکیم کا جس نے ان کی جان لی۔ چھپے چوری عقد ہوا مسند سے ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ پیشاب مسند ہی پر خطا ہو گیا اور دیکھتے کے دیکھتے وہ وہیں ڈھیر ہو گئے ـــــ بیٹی کی عمر اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی جس لمحے ان کی بیوی بنی تھی، اسی لمحہ بیوہ بھی ہو گئی۔ یہ محروم میاں بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قصور حکیم صاحب کا نہیں بلکہ خود مرحوم کا تھا کہ انھوں نے کشتے کی زیادہ مقدار استعمال کر لی جوان کے حق میں تریاق کی بجائے سم قاتل ہو گیا۔ زہر ہلاہل ہو گیا۔

برکت جنگ نے اپنے مرحوم بھائی کا پیار بھی اپنی بھتیجی کے لیے مختص کر دیا بلا شرکت غیرے شہزادی بیگم چچا ابا کے اقلیم دل کی فاتح بن بیٹھیں۔ بڑے چاؤ سے اور بڑے لاڈ پیار سے جب اس قابل ہوئیں تو مرحوم برکت جنگ نے اپنے ہی فرزند ارجمند نواب صاحب کے ہاتھ میں شہزادی بیگم کا ہاتھ

کھا دیا، اور یہ سب کچھ بہت دھوم دھڑاکے سے ہوا، بڑے کر و فر سے ہوا۔

شہزادی بیگم اس طرح نواب صاحب کے پسلی کا جوڑا تھیں۔ آتے کے آتے اس بری طرح نواب صاحب پر چھا گئی تھیں کہ اظہار مشکل ہے اب کس طرح کوئی یہ بتا دے کہ نواب صاحب چوروں کی طرح ڈیوڑھی میں چھپتے پھرتے۔ رات کو گیارہ بجے سے پہلے ڈیوڑھی میں واپس نہ آجاتے تو پھر رات بھر نہ آسکتے اور اگر آنا اتنا ضروری ہوتا تو گیٹ پھلانگ کر آتے، دیوار کود کر آتے، کسی ملازم کی ہمت نہ تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی باہر کھڑا کھڑا آہستہ آہستہ گیٹ پر کھٹ کھٹ کرنے والا اس ڈیوڑھی کا مالک ہے، اس کا آقا ہے انھیں گیٹ کھول کر اندر بلا لیتا۔ گیٹ کی دراز ہی سے کوئی سرگوشیاں کرتا۔

سرکار ابھی جاگ رہی ہیں پائیں باغ کے پچھلے دروازے کو بھی قفل ڈلوا دیا ہے۔

فانوس ابھی گل نہیں ہوئے خداوند گیٹ سے آنا، نامناسب ہے، تو کیا پچھلی دیوار ہی سے چلا آؤں؟۔

جی ہاں خداوند۔ مسقط بن مبروک بھی سرکار کے انتظار میں وہیں بیٹھے ہیں غلام زادے کو یہاں متعین کر رکھا ہے۔ اور نواب چور راستوں سے مسقط بن مبروک کے سہارے ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتے۔

گھر کا آقا بھیگی بلی بنا شہزادی کے آگے سہم سہم جاتا۔ پھر دوسرے کس شمار میں تھے۔ شہزادی کی ایک آواز نکلتی تو ہر چھوٹے بڑے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے نواب صاحب کے آگے اس کی شکایت کر دیتیں تو اس سے پہلے کہ ان کا شکایتی جملہ پورا ہوتا نواب صاحب جرمانے، معطلی اور برطرفی کے احکام صادر کرنا شروع

کر دیتے۔ شہزادی کی پیشی سے اس آدمی کو فوری ہٹا لیا جاتا اور کسی دوسرے کو متعین کر کے انھیں باور کر دیا جاتا کہ مغطلی کا عمل کر دیا گیا ہے۔

بڑے نواب صاحب کی زندگی تک شہزادی بیگم نے جو چاہا کیا۔ نواب صاحب جب شہزادی سے تنگ آ چکے تو انھوں نے بڑے نواب صاحب کے کانوں پر ڈلوایا کہ وہ کہہ سن کر شہزادی کے رویئے کو بدلنے میں مدد کریں۔

مدد تو خیر انھوں نے کچھ نہ کی۔ الٹے شہزادی کو معلوم ہوا تو وہ دراتی ہوئی بنگلے پر چچا ابا کے پاس چلی گئیں۔ قدموں سے چمٹ کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور بین کر کے نواب صاحب کی بے رخی کا وہ رونا رویا کہ الٹے نواب صاحب کو اپنا رویہ بدلنے کے لیے نواب صاحب مرحوم نے کافی سے زیادہ نصیحت کی۔ نواب صاحب اس تو تو میں میں سے تنگ آ چکے تو انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ رات بڑی ہو تو صبح بھی ڈیوڑھی کے باہر ہی ہو۔

یہ دن نواب صاحب کی جوانی کے دن تھے۔۔۔ افروز جہاں پر اس قدر فریفتہ تھیں کہ نواب صاحب دن بھر میں کسی وقت جب تک ان سے مل نہ لیتے سکھ سے نہ رہتے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کر چپ چاپ نکل جاتے۔۔۔ مصاحبین ہی ہی ہا ہا کرتے رہتے۔۔۔ شہزادی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ دن کے اجالے میں بھی نواب صاحب اپنی داشتہ کا منھ چاٹ آئے ہیں۔

دوسرے دنوں کی نواب صاحب کو فکر نہ تھی لیکن بخت افروز جہاں کو وہ ڈیوڑھی ہی کے کسی حصے میں رکھ لینا چاہتے تھے۔ بہت جسارت کر کے وہ ایک بار مسقط بن مبارک کی مدد سے افروز جہاں کو ڈیوڑھی میں لے آئے۔ لائبریری سے متصل جو حمام

تھا اس میں اپنی افروز کو چھپا رکھا ـــــ ساتھ کھاتے، ساتھ پیتے، ساتھ ساتھ بیٹھتے
اٹھتے تھے مشکل سے چار دن گزرے ہوں گے، گیلے بدن پر چادر لپیٹ کر اور اسی
حالت میں اوپر سے برقعہ اوڑھ کر افروزی چپ چاپ کرتیں ڈیوڑھی سے نکل
گئیں ـــــ تو ال میں جسم کو لپیٹ کر نواب صاحب نے جھٹ سے دروازہ کھولا
تو شہزادی مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ پٹاخ سے دروازہ کھلتے ہی گرتے
گرتے بچیں۔ نواب صاحب نے یوں کھلا کر شہزادی کو اپنی آغوش میں لے لیا ـــــ
کہنے لگے، شہزادی تھیں، کون غیر غلط یاد کر رہا ہے، بھلا میں اس حمام میں کسی
عورت کو لا سکتا ہوں۔ ابا حضور مجھے زندہ چھوڑیں گے بھلا ـــــ اور پھر ڈیوڑھی
کے سامنے احاطے میں کسی کی مجال ہو سکتی ہے جو تمہاری حکمرانی میں مدد دے ـــــ
یہ کہتے کہتے نواب صاحب نے غسل خانے کو پھر بند کر لیا، اور چٹخنی چڑھائی۔
کچھ دیر کے بعد جب شہزادی باہر نکلیں تو وہ کچھ خوش تھیں لیکن اس کے بعد
افروزی کو ڈیوڑھی میں لے آنے کی نواب صاحب نے کبھی جرأت نہ کی۔
ان سے ہمدردی نہ ہو تو پھر کیا ہو گا جس کے بس میں سب کچھ ہو وہ خود
ہی کچھ نہ رہتے تو اس سے بڑھ کر مجبوری کیا ہو سکتی ہے ـــــ پھر ایک جان زندگی
کے بکھیڑے بے شمار ـــــ بخت افروز جہاں کے اپنے گھر سے اٹھ کر نواب صاحب
کے حرم میں داخل ہونے تک کسی کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دولت کس طرح پانی
بن کر بہتی رہی، خیر صاحب دل ہی کا تو معاملہ تھا کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ بڑے بڑے
راجے مہاراجے لاکھوں کا خون کر کے ایک انچ زمین کے ٹکڑے کے لیے اپنی جان
گنوا بیٹھتے ہیں تو ان کے نام تاریخ میں محفوظ ہو جاتے ہیں ـــــ نواب نے کیا

برائی کی ـــــ یہاں تو بخت افروز جہاں کے اقلیم دل کو فتح کرنا تھا، کوئی ایک
بھر زمین تو تھی نہیں ـــــ اور پھر ایک شاعر ہی کی تو جان گئی نا ـــــ لاکھوں آدمی
تو نہیں مرے ـــــ لیکن یہ شاعر کی مخلوق بھی کچھ عجیب و غریب تھی ـــــ پتہ نہیں
اس کا خون اتنا سرخ کیوں تھا ـــــ زمانے بھر کی سرخیاں جیسے اسی کے خون کا
عنوان بن گئی تھیں ـــــ چھپائے نہ چھپتا ـــــ زبان خنجر اور آستین کے لہو میں
کوئی سازباز ہی نہ ہو پائی جو کوئی چپ رہتا یہاں دونوں ہی مل کر پکار رہے
اور اتنی قوت سے کہ نواب صاحب سوتے جاگتے یہی آوازیں سنتے ـــــ اور
جب یہ آوازیں کم ہوئیں تو نواب صاحب کی ہیرے کی آخری انگوٹھی بھی بک
چکی تھی ـــــ لیکن یہ بات اس طرح کھلے بندوں کہنے کی نہیں ہے ـــــ اس لیے کہ
ان کے تمول پہ حرف آتا ہے ـــــ وہ لاکھ بے حال سہی لیکن ان کے اپنے زمرے
کے لوگ تو ان کے تمول کے سہارے کچھ اور جینا چاہیں گے۔ جو تجوری میں بند
تھا ـــــ یہ اور بات ہے کہ تجوری کا تمول تجوری میں مقفل رہتا ـــــ وقت پر
کام آتا اس کا کام نہ تھا لیکن اس کی افادیت سے بھی تو نہیں انکار کرسکتے
ـــــ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ نواب صاحب کے تمول کی گاڑی اسی
مقفل تجوری کے سہارے چلتی۔

جب مسقط بن مبروک نے انتہائی راز میں نواب صاحب سے کہا تھا کہ تجوری
میں ایک دمڑی بھی اب باقی نہیں ہے تو نواب صاحب کچھ دیر خلاؤں میں
گھورتے رہے پھر آہستہ سے مسقط کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ مسقط
تجوری کے پہرے پر ایک مسلح عرب کا اضافہ کردو ـــــ دوسرے دن ڈیوڑھی

کے احاطہ میں لوگوں نے ایک دوسرے کے کانوں میں کہا کہ — پہرے
داروں میں اضافہ کر دیا گیا ہے — کچھ ہو آخر ہاتھی ہی تو ہے مرے گا
بھی تو گر دل ہی سے اٹھے گا — اور ہاتھی گردوں سے نہیں انگلیوں سے
اٹھتا رہا — بخت افروز جہاں کے اپنے گھر سے نواب صاحب کی
ڈیوڑھی میں منتقل ہونے تک پیچھے پیچھے تو نواب صاحب کی نوابی صرف
نام کو رہ گئی تھی لیکن بخت افروز جہاں کو ان کی نوابی سے کچھ سروکار
بھی تو نہ تھا، اپنا زندگی کا سارا حسن وہ شاعری کے ساتھ دفنا چکی تھیں
انھیں اس بات کا کبھی کبھی سہم علم ہو جاتا کہ ان کی چھوٹی سی حسین دنیا کو
تاراج کرنے میں نواب صاحب کا بھی ہاتھ ہے تو وہ کسی قیمت نواب صاحب
کو معاف نہ کرتیں۔

غم کے گھنے بادل جب چھٹ گئے تو افروزی نے سوچا یہ بادل تو ان کا
مقدر رہیں۔ زندگی پھر اسی طرح امنڈ امنڈ کر اٹھیں گے اور ٹوٹ ٹوٹ
کر برسیں گے کیوں کہ نہ کسی چھتنار کے نیچے سر چھپا کر زندگی کے باقی دن
جوں توں کاٹ لیں۔ سو وہ نواب صاحب کے پاس اٹھ آئیں۔ اور اپنی
ساری دولت اپنی بہن کو سونپ دی لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ جب
وہ اپنا چھوٹا سا گھر چھوڑ کر نواب صاحب کے پاس آ رہی تھیں تو شاید چپکے
چوری سارے بادل ان کے چوڑے چکلے سینے میں گھس آئے اور بڑے
اطمینان سے وہیں براجمان ہو گئے — باہر کڑکی دھوپ پڑتی تو تاروں سے
چمکتے، چاندنی بکھرتی لیکن افروز جہاں کے سینے میں جیسے دن رات ساون

برستا رہتا۔ گھٹائیں چھائی رہتیں۔ جیسے زمانے بھر کی برساتیں ان کے سینے میں چھپ گئی ہوں۔

نواب صاحب طرح طرح اپنی افروز جہاں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ہلکا سا تبسم بھی انھیں باغ باغ کر دیتا لیکن جیسے وہ افروزی جس سے نواب صاحب کوٹھے پر ملتے رہے تھے پتہ نہیں کہاں جا چھپی تھی۔ نواب صاحب اسی افروزی کو اب بھی افروز جہاں میں تلاش کرتے رہتے جو انھیں نہ ملتی۔

پرنز آف پیرس، مہارانی جھانسی اور لارڈ ڈڈل سن کی اب کی بار بہت شہرت تھی۔ ان کے کارناموں کے تذکروں سے تو ساری کی ساری تاریخ بھری پڑی تھی۔ لارڈ ڈڈل سن پر نواب صاحب بے طرح فریفتہ ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء سے آج تک کسی نہ کسی دوران میں کوئی نہ کوئی کارنامہ اس نے ضرور انجام دیا تھا اور پھر ٹرینر سے لے کر لید اٹھانے والے تک سب کے سب خاندانی تھے ——

نواب صاحب کو معلوم تھا کہ لارڈ ڈڈلسن کے خون میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہے —— پرنز آف پیرس ان کا گیس (Guess) نہیں تھا۔ عظیم الشان جنگ کے اصرار پر انھوں نے فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ ہاں البتہ مہارانی جھانسی نواب صاحب کے دل کا چور بنی ہوئی تھی۔ تیسری دوڑ میں مہارانی جھانسی سو فیصد اسپکٹیڈ تھی —— مہارانی کے متعلق یہ شہرت عام تھی کہ اسٹارٹ ڈفنڈ آئی ہے۔

نواب صاحب نے سیٹھ بدری وشال کو تخلیے میں طلب کیا تو کچھ دیر بعد خوش و خرم باہر نکلے سیٹھ سیڑھیاں اترتے ہوئے جھک کر کورنش بجا لایا

پھر سید ھے ہوتے ہوئے کچھ اس طرح ڈکار لی جیسے نواب صاحب بڑی مشکل سے ہضم ہو رہے ہوں لیکن اس سے پہلے کہ سیٹھ بدری وشال اپنے تانگے میں سوار ہو جاتا نواب صاحب نے کڑک کر کچھ زیادہ ہی کرخت آواز میں مسقط بن مبروک کو حکم دیا کہ بمبئی کے سفر کی تیاری کرے اور پاس بلا کر کچھ اتنے ہی رازدارانہ انداز میں کہا کہ خود مسقط بن مبروک کے دوسرے کان نے کچھ بھی نہ سنا ___ بظاہر اتنی رازداری کی کوئی وجہ نہ تھی ___ جنت انور جہاں کو نواب صاحب اپنے ساتھ بمبئی لیے جا رہے تھے لیکن یہی معمولی سی بات شہزادی بیگم کے کانوں تک پہنچتی تو بات بہت بڑھ سکتی تھی ___ اسی لیے نواب صاحب نے اس انداز سے اظہار کیا کہ خود مسقط بن مبروک کا دوسرا کان بھی محروم ہی رہا ہوگا۔

نواب صاحب کو بمبئی گئے بمشکل چار دن گزرے ہوں گے کہ مسقط بن مبروک کو ٹیلی گرام موصول ہوا ___ لہو کی ایک ایک بوند نواب صاحب کی رہین منت تھی پھر مسقط بن مبروک عرب تھے۔ عرب بھی ایسے کہ جن کی شریانوں میں حیدرآباد کا خون بھی شامل ہو گیا تھا، لیکن مسقط بن مبروک کو اس بات پر فخر تھا جب کہ دوسرے عرب اس بات کو اہانت آمیز سمجھتے تھے۔ ٹیلی گرام ملا تو وہ بے چین ہو گئے۔

بدری وشال نے اب کی بار صاف انکار کر دیا ___ وہ تو برسوں کی یاری آج کام آگئی ورنہ کیا ہوتا۔ صیقل خان رہیلہ نے مسقط بن مبروک کی بیٹھ ٹھونکی اور جیب سے سو سو کے پانچ کڑک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔۔۔ مسقط بن مبروک کو ادھر ادھر لوگوں نے صیقل خان سے بغل گیر ہوتا ہوا دیکھا۔ ادھر دوسرے ہی لمحے وہ پوسٹل آرڈر کی تکمیل کروانے بعض لوگوں کو پوسٹ آفس میں نظر آئے ___ بھبی تک کا

پاس ہو تو اس طرح ہو کہ رقم نواب صاحب کے پاس بھجوا چکے تو کس قدر باغ باغ تھے مسقط بن مبردک ۔۔۔ جامے سے باہر ہو رہے تھے پھولے نہ سماتے تھے ۔ راستے میں شہران ہوٹل کے "باہر والے" نے جھک کر سلام کیا تو رکشا میں بیٹھے بیٹھے ہی انھوں نے آواز دی کہ چنو لینا جلدی سے بڑھ کر "دو پونے میں ایک کھڑا چمچہ" ۔۔۔ چائے آگئی تو "کھڑا چمچہ" مسقط بن مبردک نے خود سنبھالا اور دوسری پیالی کی طرف اشارہ کرکے چنو سے کہا "پی لو، عیش کرو۔"

ادھر چنو نے عیش کیا، ادھر نواب صاحب نے بمبئی سے لوٹے ہیں تو سگار کا ڈبہ تک خالی تھا۔ ہاں بخت افروز جہاں کے سرخ ہونٹوں پر تبسم بھی تھا اور دمکتے ہوئے بدن پر نئی اور ماڈرن ساری تھی۔

جب مسقط بن مبردک نے شہزادی سے دست بستہ عرض کیا کہ "سن برانڈ امرتسری چاول کے پیکٹ اب بازار بھر میں نہیں مل رہے ہیں تو بھلا وہ کس طرح سمجھ سکتی تھیں کہ حکومت نے جاگیریں ضبط کرنے کی کارروائی مکمل کر لی تھی اور بیگم بازار کے سب سے بڑے بنیے نے غلہ حسب معمول قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔

چاول کی بوریاں گودام میں رکھواتے ہوئے مسقط بن مبردک حسب عادت مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے اور رفتو بادرچی سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی لیکن بغور دیکھنے سے کسی بھی صاحب نظر کو اس امر کا اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان کی مسکراہٹیں ان کی ترنگ کو جھٹلا رہی ہیں۔ ان کی چہل ان کی اداسیوں کی غماز ی کر رہی ہے جو درد نواب صاحب کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہی کرب مسقط بن مبردک کے حصے میں آتا بھی اسی طرح ضروری تھا کہ نواب صاحب کی خوشی میں ان کی خوشی

تھی، اور پھر اپنی حکومت، اپنی شوکت اور اپنی عظمت کا جنازہ کوئی مسکرا کر اٹھا لینے سے تو رہا ــــ کہاں مسقط بن مبروک نے نواب صاحب کی محبت کے طفیل اچھی خاصی جاگیر داری کی تھی، کہاں اب نواب صاحب کا بھی کوئی پرسان نہ تھا حکومت نے ابھی صرف اعلان ہی کیا کہ جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور سہ ماہی کو مقررہ رقم ہر جاگیر دار کو گذر بسر کے لیے مل جائے گی اور وہ بھی کسی کو پانچ سال کے لیے کسی کو دس سال کے لیے۔

اس اعلان نے دوسرے جاگیرداروں پر بھی کتنے گہرے گھاؤ لگائے۔ اس کا اندازہ تو خیر مسقط بن مبروک نے کیا ہی ہوگا، یا پھر تہ دل کی چکا چوند دلوں کے اندھیروں تک پہونچ نہ پائی ہو۔ اس لیے بھی کہ کسی ناتجربہ کار حکومت کی جلدبازی سے ان کی وضع داریوں میں کس قدر فرق آ سکتا تھا۔ جنھوں نے ہر موقع پر سب کچھ لٹا دیا لیکن وضع داری قائم رکھی۔ آخر نواب صاحب وہی تو تھے جنھوں نے ڈنک مارتے ہوئے بچھو کی اپنا سارا تہ ہر انگل کر دم توڑ دینے تک پروا نہ کی۔ بھرے دربار میں بالکل مسکراتے بیٹھے رہے، اور گھر آ کر جب شیروانی اتاری تو گدری گوری پیٹھ پر لال اور نیلے چکتے سے جم گئے تھے۔ بھلا بھرے دربار میں شیروانی اتار پھینکنے کی غیر شائستہ حرکت کے علاوہ کس طرح مرتکب ہو سکتے تھے۔

ہاں مسقط بن مبروک نے اتنا ضرور دیکھا کہ شہر کے سارے سیٹھ ساہوکار بنئے بزاز اس اعلان کے بعد مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کبھی جاگیرداروں کی ڈیوڑھی پر کبھی جاگیرات کے دفتر میں۔ اور ان کا دکھ درد جاگیرداروں اور ـــ نوابزادوں سے کچھ سوا ہی ہے جیسے سب کچھ حکومت نے ان سے چھین لیا ہے ــ اور

جھوٹ موٹ اعلان کر رہی ہے جاگیرداروں کے نام سے ــــ لیکن مسقط بن مبرک کو اڑتی چڑیوں کے پر گننے کا فن بھی آتا تھا ــــ جب بنیئے نے انکار کیا کہ اس ماہ امرتسری چاول کے بیکٹ تو رہے ایک طرف، کوئی ٹھیک سا یا ریک چاول بھی اس گودام میں نہیں ہے تو وہ فوری سمجھ گئے کہ در اصل وہ ان سے پوچھ رہا ہے کہ جو کچھ اب تک تم اور تمھارے نواب صاحب کھا چکے تھے، اس کی ادائی کے لیے سپرد دپٹے اوڑھی ہوئی وہ البیلی زمینیں کہاں سے آئیں گی جن کو تم جاگیر کہتے تھے ــــ اور اس کے بعد یہ سوال بہت ساروں نے دہرایا جن میں سیٹھ بدری و شال بھی شامل تھے ــــ جان کلفاٹن بھی اور صیقل خاں روہیلہ بھی۔

پچھلی رات تک جس دیوان خانے میں فانوس جلتی تھی آج اس کی چھت پر لمبی لمبی سخنیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے پھولوں سے بھرے ہوئے پودوں کو نوچ کر ننگا کر دیا گیا ہو مسقط بن مبروک کی طلبی ہوئی تو وہ دوڑ گئے کہ شہزادی آج چہل قدمی کے لیے نکلی تھیں ــــ دیوان خانے سے ہو کر گزری ہیں ــــ جو دیکھا ہے وہ پوچھیں گی ہی ــــ اور جواب ان کے ذہن میں محفوظ تھا ــــ آداب بجا لا کر انھوں نے ابھی گردن بھی نہیں اٹھائی تھی کہ شہزادی نے پوچھا ــــ مسقط ابھی ہمیشہ پھر بھی تو نہیں ہوا کہ سارے فانوس تیزاب سے دھلوا کر صاف کروائے گئے تھے۔ پھر کیوں صفائی کی ضرورت پیش آئی ــــ مسقط نے کہا کہ کسی نے حضور کو غیر غلط یاد کرا لیا ہے پھر صفائی ہو رہی ہے۔

تو کیا ہوا ہیں تحلیل ہو گئے ہیں یا عنقا ہو گئے ہیں؟

مسقط بن مبروک سہم گئے کہ بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ غصے میں آ رہی ہیں۔ ان کے

غصے کے ڈھنگ بھی نرالے تھے، غصے کے عالم میں بھی آدمی کو دیکھ کر اس کی ہستی کے مطابق الفاظ استعمال کرتیں ـــ گھر کی باورچن یا کاماٹن پر برہم ہوتیں تو بے حیا یا گالیاں بکے جاتیں ـــ مسقط بن مبروک پر غصہ کرتیں تو اتنا ضرور ہوتا کہ مغلظات سے اس کو نہ نوازتیں لیکن گھٹی کا دودھ یاد دلاتیں ضرور ـــ اب بیگم صاحبہ نے لفظ عقا استعمال کیا تو مسقط بن مبروک سمجھ گئے کہ انھوں نے اپنی دانست میں موٹی گالی دی ہے۔

تیش سے عرض کیا کہ حضور شاہ جمال صاحب جو روح القدس کی درگاہ کے بڑے سجادے ہیں سارے کے سارے فانوس پروانگی پر اٹھائے گئے ہیں۔

"کیوں بھلا؟"

"درگاہ کا عرس ہے نا خداوند۔"

"عرس تو ہر سال ہوتا ہوگا۔"

"اب کی بہت دھوم دھام سے کر رہے ہیں حضور۔"

"ہمیں اطلاع دیے بغیر اجازت دی کس نے؟"

"سرکار جلدی میں تھے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ شہزادی کے گوش گزار کر دوں۔"

"لیکن تم خود اس گھر کے مالک بن بیٹھے ہو ـــ تم نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا ہوگا کہ مجھ سے اجازت لیتے۔ ذرا آنے تو دو تمھارے سرکار کو۔"

"خداوند، خداوند۔"

لیکن شہزادی نے ایک نہ سنی۔

مسقط بن مبروک بار بار اپنی صدری کی جیب کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھتے

سے دیکھ رہے تھے جیسے جیب میں سوجتن سے رکھے ہوئے نوٹ ساری سازشوں کا بھانڈا پھوڑ دیں گے جو ابھی ابھی آکشن ہال کا مینیجر فانوس کی قیمت کی صورت میں ادا کر گیا تھا۔

شہزادی بیگم آخر کب تک سر پیٹتیں ـــــ غصہ ہو، نفرت ہو یا محبت ہو، حالات کے ساتھ ہر جذبے میں ٹھہراؤ آنا ضروری تھا ـــــ وہ آواز جو ڈیوڑھی بھر کے دل دہلا دیتی تھی، اور جو نواب صاحب کے چوڑے چکلے سینے میں بھی اتھل پتھل مچا دیتی تھیں اب خود اپنے ہی تیوروں سے مجروح ہو کر جیسے ڈیوڑھی کے ہر کونے میں بے آسرا بھٹکتی رہتی ـــــ یاسمن بوا، رپ چھپ کرتیں، ڈیوڑھی بھر میں گشت لگاتی پھرتیں ـــــ چھپے چوری مبروک بن مسقط کے ہاتھوں جو تب دیلیاں آئے دن ڈیوڑھی میں ہوتی تھیں ان پر نظر رکھتیں اور ٹھنڈی سانسیں بھر کر شہزادی بیگم تک ساری باتیں پہونچا دیتیں۔

توبہ غسل خانے کے سنگ مرمر بھی اکھڑ چکے ہیں شہزادی۔

توبہ لائبریری کے بک شیلف اور کتابیں مسقط بن مبروک لاری میں ڈال کر لے گیا ہے کہیں۔

شہزادی محسوس کرتیں کہ ڈیوڑھی میں بھائیں بھائیں کرتے اندھیرے چاروں طرف سے گھس رہے ہیں۔ یاسمن بوا نہ ہوتیں تو یہ اندھیرے اس قدر تیزی سے ڈیوڑھی بھر پر قبضہ کر لیتے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا مشکل ہو جاتا ـــــ یاسمن بوا کا دم غنیمت تھا کہ وہ ہر اندھیرے کے قافلے کے دبے پاؤں آمد کا پتہ تو دیتی تھیں ـــــ انھیں کے توسط سے شہزادی کے کانوں تک یہ بات پہونچ چکی تھی کہ ان ساری تباہیوں کے ذمہ دار

نواب صاحب نہیں بلکہ نئی حکومت ہے۔ جو دھاندلی مچا کر جاگیریں ضبط کر چکی ہے ــــــ رہ گیا ریس، جوا اور شراب کا خرچ سو وہ اتنا کہاں ہوتا ہے جو گھر کی چیزیں بازاریں نیلام ہوں ــــــ جن ہاتھوں میں پہونچتے پہونچتے ہزاروں کے نوٹ پانی بن کر بہہ جاتے تھے وہ ہاتھ اپنی مٹھی بند کر لیں تو کبھی بہتی مایا منجمد ہو کر رہ تھوڑی ہی جائے گی۔

لیکن یاسمن بوا کچھ اس انداز سے نواب صاحب کی ہمدردی کرتیں جیسے شہزادی کو جھنجھوڑ رہی ہوں کہ نواب صاحب کی ڈھیلی ڈوری کو ذرا کھینچا نہ جائے تو تھوڑ زور لگا کر ساری ڈیوڑھی کو بازار میں کھینچ لیں گے اور شہزادی بیگم خود ان سے یاسمن بوا کی ہمدردی کے در پردہ جذبے کو روز روشن کی طرح پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ لیتیں ــــــ لیکن بات احساس کی حدوں سے دور جا چکی تھی ــــــ شہزادی بیگم خود بھی تو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا انداز جانتی تھیں ــــــ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ساری ڈیوڑھی کو بازار میں جانے سے بچانے کے لیے اس ڈوری کو کھینچنے کی ضرورت ہے جس کا ایک سرا نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا لیکن دوسرا سرا شہزادی کے ہاتھ سے نکل چکا تھا ــــــ اب تو ان گھپ اندھیروں میں ڈوری کے اس سرے کو تلاش کرنے تک پتہ نہیں زندگی کہاں سے کہاں تک پہونچ جائے۔

ڈیوڑھی کا پھاٹک بند ہو جانے پر دبے پاؤں دیوار پھلانگ کر خود اپنے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہونے والا اب چار چار دن ڈیوڑھی کا رخ بھی نہ کرتا تھا۔ شہزادی بیگم خود اپنی ہی آگ میں کچھ اس طرح جل رہی تھیں جیسے جل نہیں رہی ہوں بلکہ سر جھکائے بیٹھی آگ تاپ رہی ہوں۔ ان کی اپنی آبائی جاگیر کا حصہ بھی قابل لحاظ حد تک کم ہو چکا تھا ــــــ حکومت نے جس قدر حصہ نواب صاحب کو مقرر کیا

تھا، اس میں سے پورا نصف قرض خواہوں اور ڈگری داروں کے نذر ہو جاتا
ان قرض خواہوں اور ڈگری داروں نے چونکہ متعلقہ کورٹ سے اپنے قرض کی وصو
کے لیے ڈگریاں حاصل کر لی تھیں اس لیے حکومت خود نواب صاحب کے حصے سے
نصف حصہ وضع کر کے ان میں تقسیم کر دیتی تھی ——— اور پھر یہ حصہ بھی کیا تھا ———
اوسط پانچ لاکھ جاگیر کی سالانہ آمدنی متعین کی۔ ساٹھ فی صد حق انتظام کاٹ لیا۔
پینتیس چالیس فی صد میں قرض خواہ الگ۔ حصے دار الگ، اور گذارہ پانے والے
ان کے سوا۔

ساری جاگیر کو بلا شرکت غیرے استعمال میں لانے والا آج اتنی قلیل اور ہیچ
پوچ رقم پر زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔ بس یہی اس کا کارنامہ
ہے ——— اب اگر اس سے کوئی غیر فطری مطالبہ کیا جاتا کہ وہ پلاسٹک کارڈس
کے زمرے سے اپنی انگلیوں کے پوروں کو ملوث نہ ہونے دے ——— وہ وقت آئیں
میں مل بیٹھنے والے بوڑھوں کے قہقہے روشن ہونے سے کچھ ہی پہلے اپنے اور اپنے
احباب کے تاریک سینوں میں آتش سیال بہا کر چراغاں نہ کرے اور کبھی کبھی اپنے
کارناموں سے قطع نظر کر کے بریز آف پیرس مہارانی جھانسی اور لارڈ ڈلہوزی سن
کے اور ان کے اجداد کے کارناموں سے ذرا کی ذرا خوش بھی نہ ہولے تو کیا اس
سے یہ مطالبے اس کی تذلیل کے مترادف نہ ہوتے۔ لیکن برا ہو اسکھانے پڑھانے
والوں کا کہ شہزادی بیگم نے پہلے پہلے ہی کچھ کہا تھا۔

میں بھی تو ذرا دیکھوں، اب یہ رئیس، یہ شراب، یہ جوا کس طرح چلے گا ——— شہزادی بیگم
نواب صاحب کے گلے میں پھنسے ہوئے پھندے کے ایک سرے کو کچھ اس بے ڈھب طور پر

جھٹکے مار مار کر کھینچتی رہیں کہ ایک بار ان کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا سرا پھر ان کے ہاتھ نہ لگا ۔۔۔ اب دکھانے والا چار چار دن گھر کا رخ ہی نہ کرے تو شہزادی بیگم ۔۔۔۔

"میں بھی ذرا دیکھوں" "میں بھی تو ذرا دیکھوں" کی رٹ لگائے رہیں تو بھی کیا حاصل ۔۔۔ نواب صاحب بھی کیا کریں گے بے چارے ۔ جاگیریں تھیں، ٹھول تھا، عزت تھی، غرض ہر قسم کی تن آسانیاں تھیں تو شہزادی بیگم کے ناز اٹھاتے تھے، نخرے سہتے تھے، برہم ہو جاتیں تو سو سو طرح مناتے تھے ۔۔۔ اب آدمی زیادہ اہم کاموں میں گتھ جائے، تفکرات جو ہر طرف سے آگھیریں، تو ان ناز برداریوں کے لیے وقت ہی کہاں رہ جاتا ہے ۔۔۔ وقت ملے بھی تو دل کے اندر طنابیں گاڑے والی اداسیوں کے خیموں کو اکھیڑ پھینکنا بھی تو کچھ اتنا آسان نہیں ہے نا ۔۔۔ اور جب نواب صاحب کئی دن بعد ڈیوڑھی پہونچے تو شہزادی بیگم دکھنا دکھانا سب بھول گئیں ۔۔۔ سب سے اہم مسئلہ جو درپیش تھا ۔۔۔ اور پھر اللہ میاں نے رحم جو ڈال دیا تھا ۔۔۔ اپنی نرمی کو چھپا کر بولیں ۔

تم پردہ لگی رکشا میں چھپ چھپ کر راتوں کو کس وکیل کے پاس جاتے تھے ۔۔۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے ۔۔۔ عدالت سے نوٹس لا کر کھڑے کھڑے مالک مکان نے اس غریب کو گھر سے نکال دیا ۔ برقعہ اوڑھ کر سیدھی ڈیوڑھی میں چلی آئی اور میرے پیر پکڑ لیے، کہنے لگی میں آپ کے پیر کی خاک سہی پر لوگ نواب صاحب کو میری بھی مانگ کا سیندور سمجھتے ہیں ۔۔۔ در بدر ٹھوکریں کھاؤں گی تو لوگ مجھ پر نہیں نواب صاحب پر انگلیاں اٹھائیں گے ۔۔۔ جی میں آئی کہ جھونٹے نچوا کر تمہاری آبرو کا نیلام بیچ سڑک پر کروا دوں لیکن اللہ رسول کے خوف سے سہم گئی اور پھر یہ بھی سوچا کہ کیسی سہی

مگر اپنی حقیقت اور حیثیت کو پہچانتی ہے ـــ کہنے لگی : میں آپ کے پیر چھونے کے لائق بھی نہیں ہوں ـــ میری ماں آپ کے محترم والد کے حضور میں مجرا دیتی تھیں۔"

نواب صاحب نے بوکھلا کر کہا کہ ہاں بیگم وہ جانتی ہے کہ تم کس باپ کی بیٹی ہو۔

شہزادی مسکرائیں اور کہنے لگیں ـــ لوجی اس قدر لجاجت سے کہہ رہے ہو جیسے تم مجھ سے کچھ کم ہو۔

نواب صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ شہزادی نے جیسے چونک کر کہا۔

"ہاں میں بھول ہی گئی تھی ـــ تین ماہ سے لائٹ کا بل ادا نہ کرنے پر لائٹ کاٹ دی گئی ہے "ـــ اور نواب صاحب نے مسقط بن مبرک کو رات کے اجالے کے انتظام کے لیے پکارا۔ مسقط بن مبرک بلائے گئے تھے ڈیوڑھی کے اندھیرے دور کرنے، لیکن وہ آئے تو ڈیوڑھی کے اندھیرے جیسے ڈیوڑھی سے بھاگ کر نواب صاحب کے سینے میں جا چھپے۔

نواب صاحب کے ذہن سے پتہ نہیں کیسے محو ہو گیا کہ کل مقدمے کی سماعت سے پہلے ہی جان کلفٹن نے یک طرفہ ڈگری حاصل کر کے نواب صاحب کا موٹر تک نہ چھوڑا تھا۔

قدرت علی شوفر کے گھر تین وقت کھانے کے علاوہ وہ کہاں دس بار چائے بنتی اب صرف ایک بار چولھا جلنے لگا ـــ خیر چھوٹا آدمی تھا ـــ ایک بار کھانا بھی تو غنیمت ہے ـــ جہاں بے شمار لوگ فاقے کرتے ہوں، وہاں ایک وقت کا کھانا بھی تو نعمت ہے ـــ لیکن حالت تو نواب صاحب کی دیکھی نہ جاتی تھی ـــ مقدموں کی پیروی تو خیر ان کی جوتی کرتی۔ وہ ابھی اتنے گرے بھی نہ تھے جو ہر دفتر کی سیڑھیاں

چڑھتے پھرتے، لیکن بقول نواب صاحب کے، اس فرنگی نژاد، کمینے درزی کے بچے جان کلفٹن نے ایک بار تو انھیں عدالت کھنچوایا ہی ــــ جج کوئی ان کا پرانا ساتھی ہوتا تو نواب صاحب جان کلفٹن کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے۔ سر بازار سر منڈھوا کر اس عمر میں اس کے عقیقے کی تقریب مناتے ــــ لیکن دنیا ہی بدل چکی تھی ــــ نہ منصف اپنا، نہ انصاف اپنے بس میں ــــ خیر یہ تو جو کچھ ہوتا، ہوتا ہی ــــ پہلا سوال تو یہ تھا کہ اتنے باعزت خاندان کا فرد، نواب ابن نواب جس کی رکھی ہوئی عورتوں کے بڑے چھوٹے لونڈے بھی موٹروں میں پھرتے۔ اب وہ خود بھلا کس طرح چل کر عدالت تک جائے گا ــــ نواب صاحب بہت اداس تھے ــــ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ جیسے ہر تارِ بستر خارِ بستر بن گیا ہو۔

صبح ہوتے ہوتے مسقط بن مبروک کے ذہن رسا نے پھر یاوری کی۔ سائے کی طرح چمٹے رہنے والے احباب، آفتاب سر پر آ گیا تھا، تو غائب ہو گئے تھے ــــ صرف ایک مکی میاں رہ گئے تھے جو آج بھی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ لیکن مسقط بن مبروک نے دنیا کا رنگ ڈھنگ بھیگی آنکھوں سے دیکھا تھا ــــ زمانے کی ایک ایک کروٹ کو دکھے دل سے محسوس کیا تھا ــــ انھیں نہ دوست کی دوستی پر اعتماد تھا، نہ خون کی سرخی پر ــــ سو اسی لیے ان کو اس وقت مکی میاں کی غیر متوقع آمد بھلی نہ لگی۔ ذرا کی ذرا نواب صاحب کو تخلیے میں بلا کر انھوں نے کان میں کچھ کہا ــــ اس کے بعد مکی میاں نے دیکھا کہ ــــ مسقط بن مبروک کو نواب صاحب نے بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

عدالت کا وقت ہوتے ہوتے لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب کی سواری بہت

دن بعد نکلی ہے، لیکن سوائے اس کے کہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ موٹر بدلا یدلا ہوا تھا، شوفر بدلا ہوا تھا، اور یہ دونوں بھی نواب صاحب کے تمول کی نشانی تھے، جو بدلتے ہی رہتے تھے۔

نواب صاحب عدالت میں پہونچے تو جان کلفٹن پوٹیگو ہی میں پارکنگ کرنے کی فکر میں تھا۔ نواب صاحب کا موٹر پہونچا تو اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اور جب دونوں اپنے اپنے موٹروں سے اترے تو جان کلفٹن نے تقریباً دہرا ہو کر نواب صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور عدالت کی سیڑھیاں چڑھنے تک ہنس ہنس کر اور نواب صاحب کو سو سو طرح رجھا کر ان سے معافی مانگتا رہا۔ لیکن دو ہی منٹ بعد وہ واپس لوٹ آیا اور سیدھے نواب صاحب کے موٹر کے پاس پہونچ کر لگا ڈرائیور سے مسلسل سوالات کرنے۔

ڈرائیور نے نواب صاحب کے دوست کی حیثیت سے ابھی ابھی جان کلفٹن کو دیکھا تھا۔ وہ موٹر کے قریب آیا تو تعظیماً ڈرائیور نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

کلفٹن نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا ”نواب صاحب ادھر آیا ؟“

ڈرائیور نے جواب دیا ”نہیں صاحب “

”تم کار کو برابر ڈسٹ نہیں کیا “

ڈرائیور کچھ نہ سمجھا۔

جان کلفٹن نے مڈگارڈ پر انگلی سے

صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

”ڈسٹ ہے نا“ اور پھونک مار اپنی انگلی کی پور پر جمی ہوئی گرد جھاڑ دی۔

ڈرائیور سمجھ گیا۔

"جلدی میں صاف نہ کر سکا صاحب۔"

"دل نیو کار؟"

"ٹیکسی صاب۔"

"ٹیکسی!؟" — جان کلفٹن نے تعجب سے دہرایا — "فر ٹیکسی کا نمبر نہیں لگایا۔"

"آج کل بڑا نواب لوگ اور جاگیردار پرائیویٹ نمبر کا موٹر چاہتا ہے صاب — اس لیے ہمارا سیٹھ پرائیویٹ نمبر پر ہی چلاتا ہے۔"

"ایسا کیوں مانگتا نواب لوگ؟"

"ٹیکسی میں بیٹھنا بری بات سمجھتا ہے صاب۔"

"تم ٹیکسی ڈرائیور؟"

"ہاں صاب۔"

"فریہ ڈرس؟ (DRESS)"

"نواب صاب کے پرانے شوفر کا ہے صاب — نواب صاب یہ ڈرس پہننے کا دو روپے علاحدہ انعام دیتا ہے۔"

"ونڈرفل، ونڈرفل۔"

اور جان کلفٹن نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تو ڈرائیور سمجھ نہ سکا کہ وہ نواب صاب کا مذاق اڑا رہا ہے یا خود اس کا اپنا۔

وہ جانے لگا تو ڈرائیور نے دل ہی دل میں اس کو گالی دی — لیکن

دیر گئے نواب صاحب واپس ہونے لگے تو وہ موٹر میں سوار ہونے تک ان کے ساتھ تھا ـــ سوار ہونے سے قبل اس نے خود بڑھ کر کار کا پٹ کھولا، اور بہت لجاجت سے مصافحہ کر کے مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

موٹر اسٹارٹ ہوا تو اس نے مسکرا کر نواب صاحب سے اس کے متعلق پوچھا۔

نواب صاحب کے چہرے پر چمک پیدا ہوئی ـــ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا

ایک مہینہ ہوتا ہے اس کو خرید کر مسٹر کلفٹن ـــ پرانی کار آپ نے جو ہٹا لی تھی ـــ یہ آپ کو پسند ہے نا۔

اس سے پہلے کہ مسٹر کلفٹن موٹر کی تعریف کرتا ـــ ڈرائیور نے اسکو گھور کر دیکھا اور کار بڑھا دی ـــ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں موٹر کے شیشے سے چھن کر نواب صاحب کے چہرے کو اجال رہی تھیں اور وہ تمکنت سے سگار جلا رہے تھے۔

کتاب سے کتبے تک

منور میاں خاندان بھر میں لائق فائق مشہور تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے اور جانا بھی گیا۔ عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے جب بحث و تمحیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منور میاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ بس مجبوری تھی سو اتنی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر، تھم تھم کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جاندار ہو منور میاں کی زبان پر آکے دم توڑتا ہوا سا محسوس ہوتا۔

خیر یہ تو ان کی اپنی کمزوری تھی لیکن اس سے ان کی قابلیت اور فضیلت پر بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا وہ بلاشبہ علوم مشرقیہ کے فاضل اور مغربی علوم کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ پڑھتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔۔۔۔ ان کی بیوی ان کے اس شغل سے کچھ بیزار سی تھیں۔ آخر دنیا میں اور بھی تو کچھ کام تھے۔۔۔۔ لیکن منور میاں کو کسی کام سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تھے اور ان کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں اور عینک کے بیچ میں واسطے اور رابطے کا فرض انجام دینے کے لیے اگر کچھ اور تھا بھی تو وہ پکے پانوں کی خوبصورت اور ننھی منی سی گلوریاں تھیں اور ان گلوریوں کے لیے انھیں اپنی بیوی کی گوری انگلیوں کا رہینِ منّت ہونا پڑتا تھا جو کتھے اور چونے میں کچھ اس طرح رنگ گئی تھیں کہ اب یہی رنگ ان کا اپنا اصلی رنگ ہو گیا تھا۔

منھ میں پان کی گھلاوٹ کا احساس مٹتے ہی ان کا ہاتھ کرسی کے برابر دھری ہوئی تپائی تک جاتا۔ کھلے ہوئے خاص دان میں سے ان کی انگلیوں کی پوروں میں ایک ننھی منّی سی گلوری دبی ہوئی سہمی ہوئی ان کے جبڑوں تک جا پہنچتی۔ پھر آنکھوں کی چمک عینک کے شیشوں سے گزر کر کتاب کے صفحوں کو منور کر دیتی۔ پھر جیسے ان کے دل و دماغ منور ہو جاتے، ذہن روشن ہو جاتا۔

منوڑیاں کی کتابیں ان کی بیوی کے لیے سوتناپے کا طعنہ تھیں مگر کیا کرتیں بے چاری وہ بڑے غصیلے، بڑے بارعب اور ریلے دیلے آدمی مشہور تھے۔ جس بات کو وہ اصول پسندی سمجھتے تھے اس کو ان کی سنقی القلبی کہنے سے بھی لوگ نہ چوکتے لیکن یہ سب کچھ ان کے پیچھے ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں کی پروا نہ کرتے تھے۔ راجہ بھوج بنے بیٹھے تھے اور خاندان کا ہر فرد انھیں گنگو تیلی ہی نظر آتا۔

چوڑی ہڈی اور دوہرے بدن کے مضبوط سے آدمی تھے۔ ناک نقشہ سجیلا ہی تھا لیکن رنگ کم از کم بیوی کے ساتھ ہوتے تو رنگ کا فرق اور نمایاں ہو جاتا تھا ــــ مگر داڑھی اور اس پر ٹخنوں تک چڑھا ہوا شرعی پاجامہ۔ اس کے باوجود بھی دیکھنے میں آنکھوں کو برے نہ لگتے تھے ــــ البتہ جی یہ ضرور چاہتا کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا

تو مناسب تھا اور اگر ہے بھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کس کو پڑی تھی کہ ان کے حلیے میں ان کی ہیئت میں اتنی دلچسپی لیتا۔

لیکن سنتے ہیں کہ ان کا یہ انداز مرشدانہ ان کے ساس سسر کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرسچ پوچھیے تو بیوی بھی دل ہی دل میں ان کے اس رہن سہن سے نالاں تھیں لیکن کچھ تو مذہب و شرع نے زبان پر تالے ڈال رکھے تھے کچھ شرم و حیا نے لب سی دیے تھے اور سب سے بڑھ کر منور میاں کی اصول پسندی نے اس جذبے ہی کو ان کی بیوی کے دل میں دفنا رکھا تھا کہ کبھی وہ ترنگ میں آ کر ان کے سینے سے لگی ہوئی انھیں کہہ سکتیں —— اجی اس داڑھی واڑھی کے چکر سے باہر نکل آؤ نا۔

اللہ رکھے منور میاں کے سات بچے تھے۔ آٹھویں کی آمد آمد تھی۔ وہ ہر بچے کو اللہ کی برکت پر محمول کرتے اور اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے۔ ایک برکت نازل ہو کر کچھ ہی مہینے گزرتے کہ دوسری برکت کے نزول کے لیے اللہ میاں کو ہموار کر لیتے۔ رہ گئی بیوی سو وہ تو ایک ذریعہ تھیں پھر محکوم و مجبور الگ۔ منور میاں نیم خدا تھے۔ ان کا التفات ہی تو ان کی بیوی کے لیے سب کچھ تھا "جب چاہا کر لیا ہے کنج قفس بہاراں" کے مصداق۔ جب چاہتے کچی نیند سے بیدار کر لیتے۔ اور اس طرح برکت کا نزول ہوتا رہتا۔

پھر یہ برکتیں عوں غاں کی منزلوں سے گزرتیں تو صحن میں پہونچتیں۔ صحن سے احاطے کے وسیع میدان تک جاتیں۔ میدان سے قبروں کے چبوتروں پر آتیں پھر قبروں پر چڑھ کر منھ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتیں اور انھیں گھوڑا بنا کر ان پر سواری کرتیں۔

منور میاں اپنی سسرال ہی میں رہتے تھے۔ خسر صاحب کے اجداد میں کوئی صاحب بڑے پائے کے بزرگ گزرے تھے۔ صاحبِ کمال، صاحبِ فن، صاحبِ علم و دانش۔ منور میاں کے خسر کو اس درگاہ کی دیکھ بھال اور تعمیر و ترمیم کے لیے "دفترِ امورِ مذہبی" سے سالانہ مقرر تھا۔ وہ اس درگاہ کے سجادہ نشین بھی تھے، متولی بھی۔ جو کچھ سالانہ مقرر تھا وہ یقیناً اتنا تھا کہ ٹوٹی ہوئی قبریں بنائی جا سکتی تھیں۔ احاطے کا گرا پڑا درست کیا جا سکتا تھا۔ معمولی نہیں اوسط پیمانے پر سالانہ عرس منایا جا سکتا تھا۔ چراغاں کیے جا سکتے تھے اور منور میاں کے خسر یہ سب کچھ بڑی لگن سے کرتے، بڑی فراخ دلی اور ایمان داری سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے۔ اس کے باوجود بھی اتنا بچ رہتا کہ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اوڑھتے اور منور میاں کے کفیل ہوتے۔

منور میاں بے چارے علم کی پیاس بجھانے چلے تو یہ سمندر انھیں اتنا وسیع نظر آیا کہ اس بحرِ بیکراں سے صدف و گوہر کی تلاش نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ بیوی سے واسطہ نہ بچوں سے تعلق خاطر۔ برکتوں کا نزول ہوتا اور یہ برکتیں ساس، سسر کو سونپ دی جاتیں۔ پھر قبروں کے سینوں پر چڑھ کر مونگ دلتیں۔ بیوی بے چاری مشین کی طرح خام مال منور میاں سے لیتیں۔ اور غوں غاں کرتا، ہمکتا، مسکراتا بچہ ان کے لیے حاضر کر دیتیں۔ پھر منور میاں بے چارے علم کے سمندر میں ایک ماہر غواص کی طرح غوطہ لگا آتے لیکن ان کی تشنگی بڑھتی ہی جاتی۔

آدمی شُد بُد پڑھ لے، اتنا کہ کچھ کر کے اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال لے تو آدمی آدمی ہی رہے گا۔ نہ بڑا آدمی بن سکے گا، نہ مردِ مومن، خاندان کا ہر فرد یہی سب کچھ کرتا تھا۔ لیکن منور میاں نے کچھ اور ہی ٹھان رکھا تھا۔ انھیں علم کے بحرِ بیکراں

کو اپنے دماغ کے کوزے میں بند کرتا تھا انھیں وہ سب کچھ بننا تھا جو ان کے خاندان میں آج تک کوئی نہ بن سکا تھا۔ سو انھوں نے اپنے لیے سمندروں اور طوفانوں کو چنا بھلا بیوی اور بچوں کو وہ ساتھ لیے چلتے تو ڈوب نہ مرتے بیچارے۔ انھوں نے دانشمندی سے کام لیا اور ساس سسر کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔

— اب وہ تھے اور علم کا طوفان تھا۔ اب وہ تھے اور علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ منشی عالم، منشی فاضل اور ادیب کامل تو تھے ہی انگریزی کا چسکا پڑا تو ایک پرچہ دے کر گریجویٹ ہو بیٹھے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے کبھی ارسطو کو ارسطو نہیں کہا ارسٹاٹل ہو گیا وہ — اور جس دن ارسطو، ارسٹاٹل بنا ہے، اس دن سے انھیں خود اپنی داڑھی کھلنے لگی۔ شرعی پاجامہ کھسک کر ٹخنوں تک آ پہونچا۔

ایک دن چپکے سے اٹھے، نماز فجر ادا کی اور ٹھیک دس بجے حجام کے گھر پہونچکر کنڈی کھٹ کھٹا دی۔ غریب باہر نکلا تو فوری پہچان گیا کہ منور میاں ہیں۔ جھجھک کر آداب بجا لایا۔ منور میاں بوکھلائے سے بس اس کا منھ تکتے رہے اور اپنی داڑھی کھجاتے رہے۔ اس نے بہت لجاجت اور عجز و انکساری سے اتنی صبح تشریف لانے کی وجہ پوچھی۔ منور میاں بیچارے بمشکل کہہ سکے کہ ان کی داڑھی میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ جوئیں پڑ جائیں یا چھپکلیاں اور گرگٹ جا گھسیں، حجام بیچارہ بھلا اپنے منھ سے تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ سرکار تشریف رکھیں۔ پلک جھپکتے میں داڑھی مونڈ کر سارے کے سارے بال "دامن مراد" میں بھر دوں گا۔ وہ بیچارہ حکم کا منتظر بس انھیں دیکھتا رہا۔ منور میاں پر شرم غالب تھی لیکن ارسٹاٹل نے پھر شہ دی۔ ہمت کر کے انھوں نے کہہ دیا کہ بھئی مونڈ ہی دو۔ یہ جوئیں بہت —

حجام کے کان میں جیسے کنکھجورا جا گھسا۔ اسے یقین نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر بغور منور میاں کو دیکھا جو نظر نیچی کیے اسٹائل سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

جب حجام اپنی ہنرمندی اور چابک دستی کا مظاہرہ کر چکا تو واقعی منور میاں کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ وہ منٹ دو منٹ تک بڑے چاؤ سے خود اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے رہے۔ حجام جہاں دیدہ تھا۔ بھانپ ہی گیا ہوگا کہ ان کے کٹے ہوئے بالوں میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی جوئیں نہ ملیں گی ــــ اس نے پھر بھی تکلف کرتے ہوئے کہا۔ ہی ہی ہی ہی ــــ سرکار چہرہ کیسا نکھر آیا ہے۔

منور میاں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کبھی چلے آنا ایک آدھ گھنٹے کے لیے اپنا انعام و اکرام بھی لے لینا اور ذرا بچوں کے بال بھی بڑھ گئے ہیں۔

وہ شرماتے شرماتے گھر پہونچے تو ان کی بیوی نے دیکھا کہ منور میاں اپنے ساتھ علوم شرقیہ کسی حجام کے ہاں چھوڑ آئے ہیں۔

بچے ابھی میٹھی نیند کا مزا لوٹ رہے تھے۔

اپنی بیوی کی باچھیں کھلی ہوئی دیکھ کر انھیں بڑا سکون ہوا۔ وہ دوڑی دوڑی ان کے قریب آئیں تو منور میاں نے طلب نظروں سے انھیں اس طرح دیکھا کہ بیوی نے بھی تکلف برطرف کر دیا۔

اس تبدیلی سے خاندان کا قریب قریب ہر شخص خوش ہوا۔ خسر صاحب تو پہلے ہی سے درگاہ کے سجادہ نشین اور متولی ہونے کے باوصف کرتا نیا چہرہ رکھتے تھے انھیں اپنے داماد کی اس حرکت پر اس لیے بھی پیار آیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ منور میاں میں اب بہت سی تبدیلیاں آئیں گی۔ اب وہ اپنا ہر کام اللہ اور خسر کو کم سونپیں گے۔

اور زیادہ عملی آدمی بن جائیں گے۔ اپنی بیوی اور بچوں کی ضروریات کی کفالت کو
وہ اولیں اہمیت دیں گے۔ علم کے بیکراں سمندر سے انھیں اب تک جو کچھ ہاتھ لگا ہے
اس کا مول تول کرنے کے لیے وہ بھرے بازار میں نکل آئیں گے تو اہلِ نظران کے جوہر کو
پرکھیں گے بھی۔

لیکن ستو میاں کو عملی زندگی سے جیسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔
فارسی اور عربی کتابیں چھوٹیں تو اب وہ انگریزی کتابوں کے ہو رہے۔ گلوری
منھ میں رکھتے اور عینک سے گزر کر نظروں کی کرنیں کتاب کے صفحات کو اجال
دیتیں۔

بیوی نے ایک دن دبی زبان سے احتجاج بھی کیا کہ انھوں نے جب اتنی بڑی
بڑی ڈگریاں لے لیں ہیں تو اب انھیں اپاہجوں کی طرح بیٹھ رہنا نہیں چاہیے۔
ستو میاں نے محسوس بھی کیا کہ احتجاج کے پیچھے ان کی بڑھتی ہوئی قابلیت اور
علمیت سے جلنے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہے جو ان کی بیوی کو ان کی بے عملی کے خلاف
اکسا رہا ہے۔

وہ کچھ منغض سے ہو گئے۔ کہنے لگے میں علم کا طالب ہوں علم کا بیوپاری نہیں سا ہوں۔
آج وہ بھی جیسے کچھ ٹھان کر آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بیوی بچوں کے بیوپاری تو ہو۔
ستو میاں کے لیے اب یہ بات صاف تھی کہ برس ہا برس کا دبا ہوا لاوا آج اپنے
سارے بند توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔

لہٰذا انھوں نے گلوری اٹھاتے ہوئے کہا کہ تھی چلی بھی جاؤ۔ میرے منھ کیوں آتی
ہو۔ مجھے آج اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ عورت واقعی ناقص العقل ہے۔

وہ لوٹنے لگیں تو کچھ بڑبڑاتی گئیں جو منور میاں کے پلّے نہ پڑا۔
لیکن منور میاں نے محسوس کیا کہ داڑھی کی برکتوں سے روگردانی کرکے
انھوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔
ان کا وہ رعب داب ہی جاتا رہا جو ان کے نام سے شہرت پا گیا تھا۔
ویسے بچے اور اڑوس پڑوس کے لوگ اب بھی ان کا مان کرتے تھے۔ گھر
کے بچوں کا تو اب بھی وہی عالم تھا جو داڑھی کے وقت تھا۔
بھیگی ہوئی ریت پر گھروندے بن رہے ہوں ــــــ
یا چھوٹی ڈھکنیوں میں بھر کر اس ریت کے کیک بنائے جا رہے ہوں اور
دوکان سجائی جا رہی ہو۔
طعام چینی کی رکابی اسٹیرنگ بنی ہاتھوں میں گھوم رہی ہو اور منھ سے موٹر
کی آواز نکالتے دوڑیں لگائی جا رہی ہوں۔
مکئی کے سوکھے ڈنٹھل دونوں رانوں کے بیچ اسپ تازی کی طرح مچل رہے
ہوں ــــــ

منور میاں کے ادھر سے گزرنے کی بات ہی بچوں کے کانوں تک پہونچ
جاتی تو سارے گھروندے ویران ہو جاتے۔ سجی ہوئی دوکانیں جیسے لٹ لٹا
جاتیں۔ موٹروں کے انجن سرد پڑ جاتے۔ اسپ تازی نڈھال ہو کر دیواروں کونوں
میں ایڑیاں رگڑتے۔
غرض کہ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا۔ ویسے منور میاں کوئی بجنا وہ تو نہیں تھے
منور میاں صرف ناشتہ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ کرتے۔ ان کے ناشتہ

کر چکنے تک سارے بچے گرفتار کر کے کہیں چھپا دیے جاتے۔ خاندان کے دو
چار آدمی ان کے دسترخوان پر ہوتے۔ بچوں کو سختی سے تاکید کی جاتی کہ منور میاں
کے کھانا چکنے تک کوئی بھنگی کا نام زبان پر نہ لائے۔ ملازمین تو خیر ہوشیار تھے
ہی ــــــ صبح صبح کما کر بھنگی نہ چلا گیا ہوتا اور منور میاں کے ناشتے کے
دوران میں آ دھمکنے کا احتمال ہوتا تو گیٹ ہی پر ملازم کو ٹھہرا دیا جاتا کہ اس کو
بٹھا رکھے ایسے میں ان کے کھانا چکنے تک ان کی بیوی بڑی پریشان سی رہتیں کہ جانے
کب کیا ہو جائے۔

بات اصل یہ تھی کہ بے چارے منور میاں اپنے مزاج کی نفاست سے مجبور تھے۔
نوالہ اٹھا رہے ہوں، کسی نے بھنگی آیا کی صدا دی ــــــ بس ہاتھ جھٹک کھانا چھوڑ
اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک نوالہ حلق کے نیچے پھر نہ اترتا۔
ایسا ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ ٹھہر کر بیوی بے چاری روغنی
روٹیاں، خالص دودھ میں بنی ہوئی پاسن کانی کا پیالہ اور نیم برشت انڈے لے
جاتیں۔ منا سمجھا کر، منتیں کر کے کھلاتیں۔ تب کہیں انھیں سکون ہوتا۔
آخر منور میاں دن رات جو کتابیں پڑھتے گزار دیتے تھے۔
دماغی کام جسمانی محنت سے زیادہ تھکا دیتا ہے۔
اب اس کو کیا کہیے کہ اتنا پڑھا لکھا عالم، فاضل آدمی بھنگی کے ہاتھوں مارا
جارہا تھا ہم غیروں کو ہمدردی ہوتی ہے وہ تو پھر بیوی ہی تھیں۔
منور میاں کو ایک اور بات سے چڑ تھی ــــــ ان کی بیوی اور ساس سسر نے
مرغیاں پال رکھی تھیں۔ کنبہ اچھا خاصا ہی جو تھا۔ اس کے باوجود بھی انڈوں کی کمی

ہی محسوس ہوتی۔ منور میاں کے حصہ میں زیادہ ہی چلا جاتا۔ خیر ان سے کسی کا کیا مقابلہ۔ دن بھر وہ بھلے تھے اور ان کی کتابیں اور ان کا کمرہ۔ کہیں آنا نہ جانا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بلایا جاتا تو نوکر ہوش ہاش آوازیں لگاتے پھرتے ــــــ بچے بوڑھے سب سمجھ جاتے کہ منور میاں کھانے کے لیے آرہے ہیں۔

بھئی بات یہ تھی کہ منور میاں کو بی کُٹ کُٹ کٹاک اور ان کے میاں مرغ کی علی الاعلان مجامعت سے کچھ گھن سی آتی تھی، کن انکھیوں سے دیکھتے جاتے اور لاحول پڑھتے جاتے۔ اس گھٹن کو جو اس منظر کو دیکھنے سے ان میں پیدا ہوتی تھی وہ کسی شیطان کا کرشمہ سمجھتے۔ پھر اس شیطان کا نام ان کے ذہن میں کچھ اس طرح ابھرتا ــــــ فرائیڈ، فرائیڈ۔ اور وہ فرائیڈ پر بھی لاحول بھیجنے لگتے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے منور میاں کو خیال آیا کہ یورپ جا کر تحصیل علم کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہیے ــــــ یوں بھی یہ بات مشہور تھی کہ جو مدینے کی خاک چھو آئے اس کی عاقبت سنور جاتی ہے لیکن جو لندن کی خاک چھو آئے اس کا دلدر کچھ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ دونوں عالم کی زندگیاں سدھر جاتی ہیں۔

اپنی بیوی کو منور میاں تین دن تک طرح طرح سے خوش کرتے اور رجھاتے رہے۔ بات بات میں نہ صرف مسکراتے بلکہ چھیڑ چھاڑ کر مسکراہٹوں کا جال سا بُنتے رہتے اور اس جال کے تانے بانے میں ان کی بیوی بے طرح جکڑی جاتیں۔

منور میاں کے مزاج کی یہ نرمی، یہ خستگی، یہ گداختگی ان کی بیوی کے دامنِ دل کو جیسے سونگوں اور سوتوں سے بھر رہی تھی۔ ان کی بیوی کے لیے ــــــ ان کی تبدیلی ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی ــــــ کسی اچھائی کے لیے وجوہ کی ضرورت تو ہوتی نہیں جو

ان کی بیوی اس طرح سوچتیں کہ ان مہربانیوں اور عنایتوں کا سبب کیا ہے — ویسے منور میاں دل کے برے تھے بھی نہیں۔ بس ان کی اصول پسندیاں تھیں جو انھیں شقی القلبی تک لے جا رہی تھیں یا پھر لوگ انھیں جبراً ڈھکیل کر ان سرحدوں تک پہونچا رہے تھے۔

کسی پر زور یا کمزور لمحے میں منور میاں نے بیوی کے آگے اپنی تجویز رکھی تو وہ آج ہی سے مستقبل کے خواب دیکھنے لگیں — کماتے دھماتے منور میاں۔ اچھا سا سجا سجایا گھر۔ دوڑتا بھاگتا موٹر اور ان سب پر ان کی اپنی حکمرانی۔

لیکن منور میاں پورے پانچ سال کے لیے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اتنی لمبی مدت۔ اس پر اتنا دور دراز کا سفر۔ اس خیال اور تصور سے ان کی بیوی آنکھیں نہ ملا سکیں۔ اور شفاف شفاف سے آنسو موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگے۔

منور میاں کے اتنے دن کے چاؤ اور محبت نے جن مونگوں اور موتیوں سے اپنی بیوی کے دامن دل کو بھر دیا تھا انھیں موتیوں میں سے چن چن کر جیسے وہ منور میاں کو لوٹا رہی تھیں۔

"وہ زیور ہی کس کام کے جو آپ کے کام نہ آئیں اور پھر آپ یہ سب کچھ ہمارے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔"

"اللہ پر نظر رکھیے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔"

واقعی خود منور میاں پر بھی کچھ رقت سی طاری ہو رہی تھی۔

اس طرح منور میاں کے خیالات عزائم میں بدل گئے۔ ان کی بیوی نے اپنے ماں باپ کو بھی آمادہ کر لیا۔ منور میاں کے لندن جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

تو مہینے بھر کے اندر اندر ان کے خواب تعبیر کی صورت میں ڈھل رہے تھے۔

سوٹ، موزے، ٹائیاں، شو، ایک ایک چیز خرید لی گئی۔ ان دنوں پتلون کے گیلس لگتی تھی۔ ڈھب سے گیلس لگانا تک انھیں نہ آتا تھا۔ اور پھر آتے بھی تو کیوں۔ انھیں کیا پڑی تھی جو ان بدعتوں کے پیچھے سر مارتے پھرتے ـــــ شرعی پاجامہ ابھی ابھی ٹخنوں تک آسکا تھا۔ وہی کیا کم تھا۔

ان کے جانے کا دن آیا تو ایک دوست نے ان فرائض کو پورا کیا۔ بنا سنوار کر جب منور میاں کو ان کے کمرے سے باہر لایا گیا تو واقعی وہ "نل سوٹ" میں بڑے وقیع اور معتبر سے لگ رہے تھے۔

ان کی بیوی نے انھیں آبدیدہ ہو کر بڑی محبت سے دیکھا۔ ساس نے بلائیں لیں۔ خسر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے ـــــ خاندان بھر کے چھوٹے بڑے مرد اور عورت سبھی جمع تھے۔ منور میاں بڑی تمکنت اور وقار سے نگاہِ غلط انداز ہر ایک پر ڈال لیتے۔ بہ مشکل ایک آدھ ادھورے جملے سے کسی کو نواز دیتے۔ کسی کی بات سنی ان سنی کر دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کی تمکنت کا یہ حال تھا جیسے وہ لندن جا نہیں رہے ہوں بلکہ وہاں سے سارے یورپ کی ڈگریاں بٹور کر واپس آ رہے ہوں۔

جب وہ اپنے بیمار بچے سے ملنے کے لیے اس کے پلنگ کے قریب پہنچے تو بڑی سنجیدگی سے اپنی چھڑی سے اس کے گال چھو لیے ـــــ اور بس۔

کسی بڑی بوڑھی نے کہا بھی کہ میاں سالہا سال کیلئے اتنے دور دراز جا رہے ہو تو بھلا اپنے لختِ جگر سے ڈھنگ سے تو مل لو۔ ذرا اس کے تسلی ہی دو بیٹا

تو جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ لیکن اس جمِ غفیر میں بڑھتی کی آواز کسی نے سنی کسی نے نہیں ـــــ لیکن منور میاں تو بس اس طرح مطمئن سے لوٹ گئے۔ جیسے انھوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ اور یہ ان کی اصول پسندی تھی۔ اب لوگ کچھ بھی سمجھیں۔

ان کی جدائی کا منظر بھی بالکل وہی تھا جو ایسے مواقع پر دیکھنے میں آتا ہے ـــــ لیکن خاندان بھر کے سارے بچوں کی کانفرنس میں بلا اختلاف رائے یہ بات طے پا گئی تھی کہ منور میاں کے جاتے ہی آج کا دن ان کی قید و بند کی زندگی میں مکمل آزادی کا تصور لے کر آئے گا ـــــ اور پھر یہ جو املی کے بڑے بڑے درخت ہیں ان پر کچی پکی املیاں رہیں گی اور نہ امرود کے درختوں پر باغ کے مالی کی حکومت چل سکے گی جو ناگ سانپ کی طرح پھن کھولے رکھوالی کرتا رہتا ہے ـــــ ایک صاحب نے تو یہ رائے بھی دی کہ موسمبی اور سنگتروں کے سارے پیڑوں پر جو کانٹے ہیں ان کو بلیڈ سے چھیل کر ان درختوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ ہم جب چاہیں ان پر چڑھ کر سارے پھلوں کا صفایا اوپر ہی اوپر کر سکیں۔

منور میاں کی بیوی اور ان کی ساس کے دل اس جدائی سے مغموم تھے لیکن اس غم کے پیچھے ایک درخشاں مستقبل کی جوت بھی تھی جو تسلی دیتی اور آس بندھاتی تھی۔

منور میاں کے دوست احباب ان کی متواضع فطرت کے گرویدہ تھے۔ دوست کے بچھڑنے کا غم انھیں بھی تھا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ جب وہ لوٹیں گے تو محفلیں اور اہتمام سے سجیں گی۔

لیکن منور میاں کے بچے خاندان بھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر یوم نجات منا رہے تھے۔

بچے بے چارے شاید حق بجانب ہی تھے۔ اس لیے کہ منور میاں کی نسبت یہ بات عام تھی کہ انھوں نے کبھی بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا، نہ گال چھوئے نہ پیار کیا۔ ہاں ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی اور اکثر کی۔ کبھی کبھی تو معمولی قصور پر بھی کچھ زیادہ ہی سزا دی۔ مارا پیٹا۔ دن دن بھر کمرے میں بند کر دیا اور خود کتابوں میں گم ہو کر سب بھول بھال گئے۔

ایسے میں ان کی بیوی کی بھی مجال نہ ہوتی جو بلا اجازت قید سے ان کو نکال لاتیں ــــ وہ بس تڑپ تڑپ کر کمرے کے دروازے سے لگی آنچل سے اپنے آنسو خشک کرتی رہتیں۔

بہرحال منور میاں آج جدا ہو رہے تھے۔ تو ان کی اس جدائی سے کوئی غمگین تھا تو کوئی خوش بھی تھا۔

اب ان کی بیوی بس ڈاکیے کا انتظار کیا کرتیں۔ بچوں کے لیے منور میاں کے غیاب نے جہاں ساری آزادیاں دے دی تھیں وہیں ایک بالکل انوکھی قسم کی لذت سے انھیں آشنا کر دیا تھا۔ اور وہ لذت تھی کہ ایک اکنی اور دونی پا جانے کی خوشی ــــ منور میاں کی بیوی نے کہہ رکھا تھا کہ جو بچہ میاں کا خط لے کر آئے گا اس کا منھ میٹھا کرایا جائے گا۔

یا تو منور میاں کے رعب داب نے انھیں جکڑ رکھا تھا یا اب ان کے خط کے انتظار نے ان کے کھیل کود کا بہت سا وقت اپنے لیے مختص کر لیا تھا۔ صرف فرق تھا تو مجبوری اور مختاری کا۔ غلامی اور آزادی کا۔ جبر اور اختیار کا۔ منور میاں کے خط کا انتظار سب کے سب بڑی لگن سے کرتے۔ ہر ایک دوسرے

پر سبقت لے جانے کی کوشش میں گیٹ کے چکر کاٹتا رہتا کہ کہیں ڈاکیہ نہ آجائے اور خط دوسرے کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اسی خط کے بہانے اب ان کے قدم گیٹ سے باہر نکل آئے۔ پھر بستی تک جا پہونچے۔

منور میاں کا خط آیا تو انھوں نے بیوی کو بہت کچھ لکھا تھا ــــ آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس سرزمین افرنگ پر میں نے پہلا سجدہ کیا ہے۔

پھر جب بھی منور میاں کا خط آتا، بچوں کو کبھی دونیاں ملتیں، کبھی برف کے لڈو، کبھی مٹھائی کے دونے۔

اس طرح منور میاں کے خط ان کی نظروں میں منور میاں سے بہتر ٹھہرے۔

دو سال گزر گئے تو خاندان بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ منور میاں کی بیوی اور ان کی ساس نے نماز شکرانہ ادا کی۔ منور میاں نے لکھا تھا کہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لے چکا ہوں۔ اب پی۔ ایچ۔ ڈی کی تکمیل جلد سے جلد کر لوں گا اور لوٹ آؤں گا۔ ارادہ ہے کہ یہاں سے لوٹتے ہوئے بہت ساری چیزیں لیتا آؤں ــــ گھر کی تزئین و آرائش کے لیے یہاں جو نئی نئی چیزیں ملتی ہیں ان کا وہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ــــ تمھارے اور بچوں کے لیے تو ایسی ایسی چیزیں لیتا آؤں گا کہ خاندان بھر میں دھوم مچ جائے گی۔ اور ہاں ابھی کسی اچھے سے خوبصورت گھر کی تلاش شروع کرا دو اب مجھے پروفیسری کرنی ہے تو ڈھنگ کا گھر چاہیے۔ گھر ہی پر ایک اچھی سی لائبریری چاہیے۔ اچھا سا ڈرائنگ روم چاہیے۔ ڈائننگ روم بھی ہو، اس کے بغیر اب میرے لیے کھانا مشکل ہو جائے گا۔ گھر بالکل انگریزی طرز کا "ماڈرن" ہو۔

اب اس قبرستان میں رہ کر بھلا میں کیا کر سکوں گا۔ اور اگر تم سچ پوچھو تو یہاں آنے کے بعد مجھے تو سارے کا سارا ہندستان ہی قبرستان نظر آتا ہے۔"

آخری جملہ منور میاں کی بیوی کو کچھ کھلا یا نہیں پھر بھی یہاں سے وہاں تک دور دور تک، حدِ نظر تک چاندنی ہی چاندنی تھی جو ان کی آنکھوں کے آگے بچھی ہوئی تھی ___ اس ٹھنڈی اور سہانی چاندنی میں ان کو اپنا خوبصورت مستقبل بالکل صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔

منور میاں نے اپنے گھر کا سارا نقشہ کھینچ کر خود ہی بھجوایا تھا۔ اب جو کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کے لیے منور میاں کی بیوی تصور ہی تصور میں اس نقشے میں رنگ آمیزی کرتی رہتیں ___ کہ یکایک ایک نئی نویلی تحریر ملی جس میں لکھا تھا کہ میرے دوست منور علی خاں پر فالج کا حملہ ہونے سے انھیں ہاسپٹل میں شریک کرا دیا ہے۔ انھیں لکھنے پڑھنے سے ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔ وہ روبہ صحت ہیں۔ تردد و فکر کی کوئی بات نہیں۔ اللہ پر نظر رکھیے اور ان کے لیے دعا کیجیے۔ وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔

خط ملا تو جیسے چٹکی ہوئی چاندنی کو کالے کالے بادلوں نے چاند سے اس طرح علاحدہ کر دیا کہ نہ چاندنی کا وجود رہ گیا نہ چاند کا۔

امیدوں کے سارے لاؤ لشکر نا امیدی کے جنازے بن بن اٹھتے رہے۔ منور میاں کی بیوی اور منور میاں کی ساس سسر اس درگاہ کا طواف کرتے رہے جس درگاہ کے سہارے ان کی زندگی کے اچھے دن وابستہ تھے۔ پھر یکایک معلوم ہوا کہ منور میاں لوٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اب انھیں وہاں

رہنے سے منع کر دیا ہے۔ فارج کے بعد وہ اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ڈاکٹر دل کا خیال ہے کہ اب وہ وہاں کے موسم کی شدت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ان کے لیے اپنے وطن کو لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔

منور میاں لوٹ آئے تو اس دن میں اور اس دن میں کوئی خاص فرق نہیں تھا جس دن وہ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر پردیس گئے تھے ___ اور آج جب کہ وہ اپنے دیس میں، اپنے گھر میں، اپنے بیوی بچوں میں لوٹ آئے تھے تو میدانِ جنگ سے بھاگے ہوئے سپاہی کی طرح اس کی بہادر بیوی نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی اس لیے کی تھیں کی کہ زخم پیٹھ پر تھا سینے پر نہیں تھا۔

یہاں پہنچے تو اپنے وطن کی آب و ہوا انھیں راس آئی ___ وہ دن بدن صحت مند ہوتے گئے۔ وہ پیر جن کے سہارے دیر تک کھڑا رہنا اور چلنا پھرنا ان کے لیے مشکل تھا تیز گامی کی طرف مائل تھے۔ اب وہ چھڑی کے ٹیکے بغیر بھی چل لیتے۔

منور میاں کی بیوی کے دل پہ چھائے ہوئے بادل اب چھٹ رہے تھے اور چاند بادلوں کی اوٹ سے کچھ اس طرح تاک جھانک کر رہا تھا جیسے موقع کی تلاش میں ہو کہ چپکے سے دل کی ساری دھرتی کو اپنی نورانی چادر میں لپیٹ سمیٹ کر چلتا بنے گا۔

اور منور میاں کی بیوی اس چاند کی ایک ایک کرن کو پکڑ کر اپنے ظلمت کدۂ دل میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

ان کرنوں میں جتنے رنگ تھے ان رنگوں سے ان نقشوں میں رنگ آمیزی کرنا چاہتی تھیں جو منور میاں نے بڑے چاؤ اور بڑے جتن سے اپنے خطوط کے ذریعہ انھیں

تحفے میں بھیجے تھے۔

لیکن منور میاں بے چارے پھر اس ہندوستان کے ایک قبرستان میں آبسے تھے جو سارے کا سارا خود ایک بہت بڑا قبرستان انھیں نظر آنے لگا تھا۔

اب انھیں بہر حال یہیں زندگی تلاش کرنی تھی۔ فی الوقت ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھتے ہی بڈ ٹی پیتے ــــ پھر حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو کر سوٹ پہنتے، بڑے اہتمام سے ٹائی باندھتے یا بو لگاتے اور بڑی تمکنت سے چبوترے پر قبروں کے بیچ بچھی ہوئی کرسیوں پر جا براجتے۔ کچھ دیر مختلف انگریزی اخباروں کا مطالعہ کرتے پھر ان کے دوست واحباب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

منور میاں کی پہلو دار شخصیت، ویسے تو پہلو در پہلو تھی لیکن ان کی شخصیت کے دو رخ بڑے متضاد تھے۔ وہ شخص جو اپنے بیوی بچوں میں اصول پسندی کے تمام بد شقی القلبی کی سرحدوں تک جا پہنچا تھا۔ اپنے دوست احباب میں بڑا ہی مرنجاں مرنج، متواضع اور منکسر المزاج سمجھا جاتا تھا۔

دوستوں کی تواضع کر کے، انھیں کھلا پلا کے ایک عجیب قسم کی خوشی انھیں محسوس ہوتی ایک ایسی خوشی جس کی لذتوں سے صرف جذبات آشنا ہوتے۔ اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ منور میاں نے برے دن کم ہی دیکھے تھے ــــ اچھے دن کبھی اچھے نہ رہے بھی تو برے دن سے دور رہی رہے۔ اب ان اچھے اور برے دنوں کے ہیر پھیر میں ان کے ساس سسر کا خیال یہ تھا کہ منور میاں کے دن خواہ وہ اچھے ہوں یا برے خود ان کے اپنے تو ہیں نہیں ــــ خود ان سے منسوب کیے جائیں وہ تو بس اس طرح آن بسے تھے جیسے گھر دامادی پہلے ہی سے طے تھی۔ ایسے میں اچھے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے

بھی ہوئے، برے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے بھی ہوئے۔

بات کچھ بھی ہو لیکن ایسا ضرور تھا کہ منور میاں کما ڈپوت بھی ہوتے تو ان کی شخصیت، ان کے دوست احباب کے لیے جیتیاں نہ ہوتی جو آج نہ کمانے پر ساس سسر اور بیوی بچوں کے لیے بنی ہوئی ہے۔

دوست احباب سے جو وقت بچتا وہ کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ یورپ جانے سے قبل کتابوں کی یہ رفاقت ان کی بیوی کو سو سو طرح کھلتی تھی۔ لیکن جب انھوں نے آکسفورڈ سے ایم۔ اے کامیاب کیا تو بیوی سمجھ گئیں کہ اس کامیابی میں کچھ ان کتابوں کا بھی دخل ہے جو بڑی بے ترتیبی اور کس مپرسی کے عالم میں پڑی منور میاں کی منتظر تھیں۔

ان کی بیوی نے جھاڑ جھٹک کر ایک بار انھیں قرینے سے جما یا بھی تھا۔

لیکن آج کتابوں کی طرف منور میاں کی واپسی ان کی بیوی کے لیے واقعی ایک سانحہ تھی۔ ایک ایسا سانحہ جو ماضی کی چھوٹی بڑی ساری محرومیوں کو دہرانے کے درپے ہوں ایک ایسا سانحہ جو بجائے خود ماضی اور مستقبل بن کر مقدر بن گیا ہو۔

یورپ سے لوٹے تھے تو یان کی گلوریوں کو "پڈلی" نے اس طرح نکال پھینکا تھا جیسے گوری فرنگن ہندوستانی کلوٹی کو گھر سے باہر کرتی ہے ——— لیکن آہستہ آہستہ منور میاں نے دونوں میں سمجھوتہ کروا دیا۔

اب گلوریاں بھی تھیں۔ "پڈلی" بھی تھی۔

چائے خواہ دن میں سو بار منگوائی جائے منور میاں کی بیوی اسے "پڈلی" ہی کہتیں۔ اور یہ سلسلہ دن بھر کچھ اس طرح چلتا کہ منور میاں کی بیوی "پڈلی" گلوریوں اور

کتابوں کے درمیان معلق معلق سی لٹکا کرتیں۔

منو میاں کے ایک پروفیسر دوست نے انھیں لکھا کہ میں تمھارے لیے یہاں یونیورسٹی میں بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ تین ساڑھے تین سو روپے تو تمھیں بہرحال مل ہی جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ مالک ہے۔ پہلے قدم تو جم جائیں۔

جس وقت خط پہونچا ہے اس وقت منو میاں حسبِ دستور فل سوٹ پہنے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ چبوترے پر قبروں کے بیچوں بیچ بیٹھے تھے۔ خط پڑھ کر وہ مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ میں طنز تھا، حقارت تھی۔ پھر اپنے احباب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اکمل کمال عرشی کا۔

احباب نے پوچھا۔ آخر کیا بات ہے۔ اور یہ کون صاحب ہیں۔

منو میاں کہنے لگے کبھی آسقور ڈ میں مجھ سے دو سال سینیر تھا۔ معاشیات سے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ آدمی بڑا پر خلوص ہے۔ اسے بہت محبت ہے مجھ سے۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب وہ ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اس کے تھیسس میں نے ہی لکھے تھے اور اس کو فوری منظور کر لیا گیا۔ میرا بڑا معترف ہے۔ ہمیشہ کہتا تھا کہ تم نہ ہوتے تو جانے کیسے میں ڈاکٹر ہوتا۔

منو میاں ڈاکٹر نہ ہو سکے تھے تو اس طرح اپنے ساتھی ڈاکٹروں پر اپنی فوقیت جتلا کر شاید اپنے نفس کی تسکین کا سامان مہیا کر لیتے۔ ان کی ایسی شیخی میں، ان کی محرومیاں صاف جھلک پڑتیں۔

ایک صاحب نے پوچھا " پھر کیا کوئی بدتمیزی کی ہے انھوں نے "

"نہیں بھئی بدتمیزی کیا کرے گا وہ مجھ سے۔ ہزار پندرہ سو تو کماتا ہی ہو گا۔ پروفیسر جو ہے۔ اب مجھے لکھا ہے کہ تین سو ساڑھے تین سو کی لکچری قبول کر لوں۔ اتنا گیا گزرا تو نہیں ہوں میں۔"

"ہاں بھئی تین سو ساڑھے تین سو ماہانہ تو آپ یورپ جانے سے پہلے کما سکتے تھے۔" ایک صاحب نے ہاں میں ہاں ملا کر حقِ دوستی ادا کیا۔

منور میاں کہنے لگے ——— بات حقیقتاً یہ ہے کہ میرا محبت مان کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں یونیورسٹی میں پڑھاؤں تو ملک و قوم کا بھلا ہو گا اور آنے والی نسلیں ایسی نکلیں گی کہ ہم ان پر فخر نہ بھی کر سکیں تو کم سے کم اعتماد تو کر سکیں گے۔

تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ ایک بے تکلف دوست نے پوچھا جن کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی لیکن وہ گورنمنٹ میں سات سو روپے کے ملازم تھے۔

بھئی اس میں سوچنا کیا ہے۔ میں تو انکار کر دوں گا۔ میں اپنی صلاحیتوں کو اس طرح برباد کرنے سے تو رہا۔ ملک و قوم کا بھلا دیکھوں تو لیڈر نہ بن جاؤں ——— مجھے تو اپنا علم بانٹنا اور تقسیم کرنا ہے لیکن اس طرح بھی نہیں۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔

اور منور میاں نے دھڑ سے انکار کر دیا۔ صاف لکھ دیا کہ مجھے پروفیسری مل سکے تو بہتر ورنہ مجھے معذور سمجھو۔ اپنی صلاحیتوں اور زندگی کو میں اتنے سستے داموں نہیں بیچ سکتا۔

ساس سسر نے جب یہ سنا تو دل ہی دل میں کاہش کھا کر رہ گئے۔ منھ کھول کر یہ بھی نہ کہہ سکے کہ صاحبزادے اپنی قابلیت پر اتنا گھمنڈ بھی نہ کرو۔ زمانہ نازک ہے نازک

تر آرہا ہے۔ آج جو دن کے اجالے ہیں وہ کل کے اندھیرے بن رہے ہیں۔

بیوی نے محسوس کیا کہ منو میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اتنا سب کچھ پڑھ لکھ کر صرف تین ساڑھے تین سو روپے پر کون اوقات خراب کرے۔

لیکن جب خط لکھ کر منو میاں لفافہ بند کرنے لگے تو ان کی بیوی کے دل میں خیال گزرا کر ہاتھ پکڑ کر منو میاں کو لفافہ بند کرنے سے روک دیا..... اور انگلیاں بتاتیں کہ دیکھو تو یہ تمھارے بچے کیسا پھوٹ پھاٹ کر بڑھ رہے ہیں۔ یہ مونا تو کیسا قد نکال رہی ہے۔ لیکن منو میاں لفافے کا گوند زبان پہ پھیر کر اسے بند کر چکے تھے۔

سنتے ہیں کہ منو میاں نے ایسی ہی کئی نوکریوں کو ٹھکرا دیا تو شاید نوکریوں نے بھی مل جل کر سازش کر لی اور منو میاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور رکھا۔

تیر کمان سے نکل جاتا ہے تو صید کے پیوست ہو کر ہی سہی مل تو سکتا ہے لیکن یہ تو گیا وقت تھا جس کا گھائل خود ہی ہوتا ہے جو اسے کھو دیتا ہے۔

اور اب منو میاں کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ یہ سب کچھ انھوں نے کھو دیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو گیا کہ منو میاں بے چارے قبروں کے بیچوں بیچ کھڑے اپنی نکٹائی اور پتلون کی کریز درست کرتے رہ گئے۔

چار دن کے بعد نیند نے منو میاں کے خسر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں تو حویلی کے بیچوں بیچ وہیں دفنائے گئے جہاں منو میاں کی بیٹھک میں بید اور کرسیاں بچھی تھیں۔

منو میاں زندگی کے کسی حادثے کے آگے سر جھکا دینے والے نہیں تھے۔ اپنے کسی پیارے کی موت زندگی پر وار کر سکتی ہے۔ گھاؤ لگا سکتی ہے۔ ہمت کیا تو ایک آدھ ناسور کہیں رکھ چھوڑا لیکن سرے سے زندگی کے قدم پکڑ کر اس کو پتھر تو نہیں بنا سکتی

منو میاں کو یہ گھاؤ وقت کے ہر ہر قدم پر لگتے گئے۔ انھوں نے باپ کی محبت اگر دیکھی تھی تو اپنے خسر ہی کے روپ میں ۔۔۔ اور اس روپ نے انھیں ہر قسم کا اطمینان دے رکھا تھا۔ آسائش دے رکھی تھی لیکن ۔۔ اب وقت ان سے اپنی نا قدری کا انتقام لینے کے لیے جیسے مسلح ہو کر آیا تھا اور انھیں للکار رہا تھا۔

منو میاں نے جب یہ للکار سنی ہے تو ان میں لڑائی باندھنے کی ہمت نہ رہ گئی کر رہ گیا۔ سوٹ ہی کو وہ بھول بیٹھے جیسے اشارہ کر کے بیوی کو جیسے منع کر دیا کہ بڑی بی اپنے ہاں وقت نہیں ہے ۔۔۔ اور جس عالم میں بیٹھے تھے اسی عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ للی کو پکارا اور للکارتے ہوئے نبرد آزمائی کے لیے کود پڑے ۔۔۔ لیکن ان کے پیروں میں رعشہ تھا۔ ان کا ہاتھ مفلوج تھا۔ وقت نے انھیں معاف نہیں کیا۔ بڑے گہرے گھاؤ لگائے۔ خون رستا رہا تو زخم پھر مندمل نہ ہوا۔

منو میاں کے برادر نسبتی جب ان کے خسر کے بعد درگاہ کے سجادہ نشین قرار پائے تو اس قبرستان سے منو میاں کو اپنی زندگی کا ناطہ توڑ لینا پڑا۔

وہ ایک چھوٹا گھر لے کر الگ جا بسے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ اے کا گون ان کی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھا۔ ایسا انعام جسے آدمی اپنی صحت دے کر حاصل کرتا ہے دوسرے معنوں میں زندگی دے کر۔

انھوں نے جھاڑ پونچھ کر اس گون کو نکالا جیسے بچے لے [illegible] کا جسم بنا کر لپیٹتے تھے دھو دھلا کر ان کی بیوی نے گون کو کھونٹی سے ٹانگ دیا ۔۔۔ یہ گون منو میاں کا علم تھا۔ ان کا ادراک تھا، ان کا فلسفہ تھا۔ ان کی فضیلت اور عظمت تھا جو اداسی کی وجہ اور پھول رہا تھا اور یہی گون ان کے ایم۔ اے ہونے کی دلیل تھا۔ کوئی ڈگری کسی نے

ان کے پاس نہیں دیکھی۔ نہ خود انھوں نے ہی دکھانے کی کوشش کی۔

اس طرح انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی درس و تدریس کے لیے ایک خانگی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ لیکن انھیں حسرت ہی رہی کہ ادارے کے نام کا بورڈ ہوتا کہ اپنی ڈگری اور اپنے نام کے ساتھ باہر لگا سکتے تاکہ ان کی ڈگری دیکھ کر شائقین علم کا اشتیاق بڑھتا ـــــ کوئی بھولا بھٹکا طالب علم کسی نہ کسی طرح اس درس گاہ کے دروازے تک آ پہونچتا تو منور میاں بڑے چاؤ سے بڑی شفقت اور محبت سے اسے اپنی درس گاہ میں کھینچ لاتے اور اس کو علم کے بیکراں سمندر سے چن چن کر وہ سارے موتی دے دیتے جن کی آب و تاب کے سہارے زندگی کے بھرے بازاروں میں وہ ان کے کھرے کھرے دام وصول کر سکتا ـــــ کم سہی لیکن جتنے بھی شاگرد منور میاں کے نکلے ہیں ان میں سے اکثر اپنی اپنی یونیورسٹی کے لیے قابل سمجھے گئے ـــــ اور اچھی خدمتیں پائیں۔ اور اس فخر نے منور میاں کی محرومیوں کو کچھ ایسا دلاسہ دیا کہ ان کی زندگی کے دنوں میں کچھ اضافہ ہو گیا۔

لیکن پھر ان کی صحت بہت تیزی سے ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اپنے لحیم شحیم جسم کا بوجھ اٹھاتے غالباً ان کے پیر تھک گئے چنانچہ پیروں نے ہی سب سے پہلے ان کا ساتھ چھوڑا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہوا۔ پھر ضیق النفس نے ان کی ساری ہستی کو کھوکھل کر رکھ دیا۔

درس و تدریس اب منور میاں کے بس کا روگ نہ تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ منور میاں یورپ سے جتنے فلسفے لے آئے تھے ان سا...

فلسفوں کے ردِ عمل نے انھیں مذہب سے قریب تر کر دیا تھا۔ زندگی کی تشنگی اور ہر محرومی پر انھوں نے خدائے عز و جل کا شکر ادا کیا اور یہی ایمان کا شعار بن گیا تھا۔

قادرِ مطلق پر اتنے مکمل ایقان اور اتنے مستحکم ایمان سے پتہ نہیں آدمی کا اعتماد اپنی ذات پر سے اٹھ جاتا ہے یا عشرتِ قطرہ ہو کر دریا میں فنا ہو جانے ہی کو حاصلِ زیست سمجھتا ہے۔ بہر حال کچھ ہو سب کچھ چھن جانے کے بعد بھی جاگتی اور چمکتی ہوئی آنکھیں منو میاں کے ساتھ رہ گئیں تو انھوں نے رب العزت کا سو سو طرح شکر ادا کیا کہ انہی آنکھوں کے سبب ان کی کتابیں آج بھی ان کی رفیق تھیں، مونس و غمخوار تھیں۔

لیکن یہی آنکھیں منو میاں کے لیے غم و اندوہ کا ایک ایسا تحفہ بن جاتیں کہ ان کی ساری کتابیں ان کے برابر، ان کے سرہانے، ان کے اطراف چھوٹی چھوٹی قبروں کی مانند بکھر جاتیں۔ اور ان قبروں کے پاس سے ان کی جوان بیٹیاں کچھ اس طرح گزرتیں جیسے اپنی جوانیوں کو ان کی کتابوں میں تلاش کر رہی ہوں۔

منو میاں آنکھیں بند کر لیتے، گڑگڑاتے۔ یا اللہ مجھ سے میری آنکھیں چھین لے لیکن پھر سنبھل جاتے۔ توبہ استغفار کر کے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کے کناروں کی نمی کو اپنے دامن میں چھپا لیتے — پھر گڑگڑاتے۔

یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔

اب وہ چاہنے لگے تھے کہ زمانے بھر کی محبتیں بٹور کر چپکے چپکے چوری اپنے

بال بچوں میں تقسیم کر دے اس لیے کہ خود ان کے پاس دینے کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ شخص جو خود دوسروں کے لیے قابلِ رحم ہو وہ کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ یہاں تک کہ محبت بھی نہیں اس لیے کہ وہ غرض مند سمجھا جاتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے سو جانا۔ سوتے سوتے آنکھیں کھول کر اپنی کتابوں میں کھو جانا۔ اب یہی سب کچھ ان کی زندگی میں رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں اب بھی کتابیں انھیں کچھ دیتی تھیں یا وہ خود ہی اپنی آنکھوں کی جوت ان کتابوں کی بھینٹ کر رہے تھے۔

ایک رات جب وہ تھکے ہوئے تھے اور تھکن دکھائی دے رہے تھے ان کی بیوی اور بچوں نے انھیں کتابیں دیکھنے سے منع کیا۔

چپ چاپ فرمانبردار بچے کی طرح انھوں نے کتاب رکھ دی۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے سب کو دیکھا، اپنی بیٹیوں پر نظر اٹھی تو جیسے وہ ان سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک بار کسی نے نہیں دیکھا کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد آنکھوں کے کناروں کی نمی کو انھوں نے اپنے دامن سے پونچھا بھی۔ صبح ہوئی تو اپنی آنکھوں کی جوت وہ کتابوں کی نذر کر چکے تھے۔ کتابیں ان کے آس پاس بکھری ہوئی تھیں ـــــ چھوٹی چھوٹی قبروں کی طرح جن میں زمانے بھر کا علم دفن تھا۔ نئے پرانے سارے فلسفے دفن تھے۔

منورمیاں نے اسی قبرستان سے اپنا ناطہ پھر سے جوڑ لیا جو انھوں نے مجبوراً توڑ لیا تھا۔ لیکن اس چبوترے پر انھیں جگہ نہیں ملی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کتابوں کے بل بوتے پر اس ناقدرشناس زندگی کے منھ پر تھوک دیا کرتے تھے۔

انھیں چبوترے کی حصار کے باہر ہی دفن کر دیا گیا۔
سُنتے ہیں پڑوس کے درزی کے کسی کھلنڈرے لڑکے نے ان کے سرہانے دیوار
پر ٹیڑھے میڑھے خط میں کتبے کی طرح حاشیہ بنا کر لکھ چھوڑا ہے۔

میر منور علی خاں مرحوم

ایم۔ اے (آکسن)

یہ لڑکا اپنے کسی ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ میرے باپ نے ہی منور میاں کا ایم۔ اے
کا گاؤن سیا تھا۔

شکن در شکن

"میں کیا کرتا بھلا ——؟"

"میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھالی کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے۔"

اتنا کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گیا ——

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے لیکن آنسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

مجھے واصف سے ہمدردی تھی۔ وہ اتنا بامروت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے الزام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جائیے وہ آپ کی کلائی مروڑ کر خنجر آپ سے چھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا —— آپ سے التجا کرے گا کہ بھئی مجھے چھوڑ دو —— چھینا جھپٹی میں کہیں تمہارا ہاتھ زخمی نہ ہو جائے۔

وہ روتے ہوئے گلے سے کہنے لگا "کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے؟"

میں نے اس کو تسلی دی ــــ "یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود تمہاری بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہے ــــ لیکن"ــــ

"سمجھ بھی چکو بھئی ــــ یہ لیکن کیا ہے؟"

"لیکن ــــ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے۔"

وہ بچوں کی طرح رونے لگا ــــ

"تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی ہے؟"

"میں نے کب کہا ــــ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تمھیں اس طرح اپنے آنسو ضائع نہ کرنا چاہئیں۔ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر تھوک کر گزر کیوں نہیں جاتے۔ جرات کی یہ کمی، ہمت کا یہ فقدان آدمی کو تحر دمیوں کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟"

"تمھیں یہی کرنا چاہیے کہ تمھیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔"

"پھر"

"تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا مجرمانہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو تمہارے پیچھے پیچ رہی ہے۔ تم پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا۔"

شکن در شکن

"میں کیا کرتا بھلا ——؟"

"میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھائی کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے۔"

اتنا کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گیا ——

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے لیکن آنسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

مجھے واصف سے ہمدردی تھی۔ وہ اتنا بامروت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے اتہام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جائیے وہ آپ کی کلائی مروڑ کر خنجر آپ سے چھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا —— آپ سے التجا کرے گا کہ بھئی مجھے چھوڑ دو —— چھینا جھپٹی میں کہیں تمہارا ہاتھ زخمی نہ ہو جائے۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگا "کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے ——؟"

میں نے اس کو تسلی دی ـــ "یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود تمہاری بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہے ـــ لیکن"ـــ

"سمجھ بھی چکو بھئی ـــ یہ لیکن کیا ہے؟"

"لیکن ـــ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے"

وہ بچوں کی طرح رونے لگا ـــ

"تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی ہے؟"

"میں نے کب کہا ـــ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تمہیں اس طرح اپنے آنسو ضائع نہ کرنا چاہئیں۔ اس سے سچائی مرجاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منھ پر تھوک کر گزر کیوں نہیں جاتے۔ جرأت کی یہ کمی، ہمت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟"

"تمہیں یہی کرنا چاہیے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہیے"

"پھر"

"تم بہ بانگ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا مجرمانہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو تمہارے پیچھے چیخ رہی ہے۔ تم پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا"

وہ سگریٹ جلا کر کچھ اس طرح نیچی نیچی نظروں سے اپنے ابھرے ہوئے سینے کو دیکھنے لگا جیسے رازوں کے اس خزانے سے سب سے قیمتی راز چن لینا چاہتا ہے جو اسے بے گناہ ثابت کر سکے۔

میں نے اسے پھر چھیڑا۔ "باچھوں میں دبا ہوا سگریٹ ایک حقیقت ہے تو اس کا دھواں تمھاری آنکھوں کو معاف نہیں کرے گا اس طرح گردن جھکائے کیا سوچ رہے ہو۔"؟

اشکوں کی جگہ سگریٹ کے دھوئیں نے اب اس کی آنکھوں کو پانی سے چھلکا رکھا تھا۔ لمبا سا کش لے کر وہ کہنے لگا۔

"یار دنیا عجیب ہے۔"

"اہمیت دو تو سب کچھ ہے، نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں یار تم نہیں جانتے ـــ اب دیکھو نا۔"

وہ کہتا کہتا رک گیا ـــ چاروں طرف نظریں گھما کر اس طرح دیکھا جیسے میرے سوا اور بھی کوئی چھپ کر سن رہا ہو۔

"کوئی نہیں ہے ـــ کہہ بھی چکو اب۔" میں نے ہمت بندھائی۔

"وہ بچہ اسی مرشد کا ہے جس کے ہم دونوں۔"

"تم دونوں جس کے مرید ہو" ـــ میں نے جملہ بے چینی سے پورا کر دیا۔

"ہاں۔"

"تمھیں یقین ہے!"۔

"اتنا ہی جتنا یہاں تمھارے اور میرے وجود کا اس وقت یقین ہو سکتا ہے۔"

"پھر تم نے صاف صاف سب کے منہ پر کہہ کیوں نہیں دیا"؟

"کیسے کہہ دوں یار"۔؟

"ایسے ہی جیسے اب مجھ سے کہا ہے"

"تمھاری بات اور ہے"

"یہ سب بکواس ہے" میں برہم ہو گیا۔ "تم میں اتنی جراءت ہی نہیں ہے کہ تم روشنی کو روشنی کہہ سکو اور اندھیرے کو اندھیرا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کچھ ہی دن پہلے اپنے اس مرشد میں جلوہ ہی جلوہ دیکھتے رہے ہو ـــــ نور ہی نور"

"ایسا نہیں ہے"

"ایسا ہی ہے ـــــ تم شاید بھول رہے ہو کہ تمھیں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جب اپنے مرشد کے سامنے ہوتے ہو تو ایسا محسوس کرتے ہو کہ جیسے کسی طاقت نے، کسی عظیم سچائی نے، کسی روشنی نے ـــ تمھیں اپنے احاطے میں محصور اور محفوظ کر لیا ہے"

"اور تم اس بات کی ہنسی اڑاتے رہے ہو"

"اور تم آج ہنسی اڑانے کی طاقت سے بھی محروم ہو گئے ہو"۔ میں نے پھر وار کیا۔

"لیکن وہ مجھ سے محبت کرتی ہے!"

"تم آج بھی یہی سمجھتے ہو!"

"آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہی سمجھوں"

"تم پاگل ہو گئے ہو، تم جیسے آدمی کے پیچھے اپنی توانائیاں صرف کرنا بجائے خود بے وقوفی ہے"

وہ کچھ دیر در و دیوار کو تکتا رہا۔ ایسی نظروں سے جیسے در و دیوار اس کو تک رہے ہوں اور وہ خائف خائف سا انھیں بس دیکھ رہا ہو۔ دیکھے جا رہا ہو۔

جب جنون کا یہ عالم ہے تو جھوٹ موٹ ہی کہہ دو کہ بچہ میرا ہے۔ نہ تمھاری محبوبہ کی رسوائی ہوگی نہ ہی تمھارے مرشد کی عظمت میں کوئی فرق پڑے گا۔"

لیکن اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا اب چلتے ہیں۔" وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ روپیے مجھے قرض دے سکتے ہو؟"

اس نے اپنی دوستی کی اتنی طویل مدت میں پہلی بار مجھ سے قرض مانگا تھا۔ میرا عالم یہ تھا جیسے میں کہیں کا نہیں رہا ہوں۔ جیسے زمانے بھر نے اپنے پیروں تلے مجھے روند کر پھینک دیا ہے۔ میری جیب اس طرح خالی تھی جیسے اس کے قرض مانگنے پر میرا دماغ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کیے چپ چاپ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

"میں ضرور لوٹا دوں گا یار۔"

میرے پس و پیش پر اس نے مجھے غلط سمجھا۔

میں نے چپکے سے اپنی سونے کی جڑاؤ انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی جو کچھ آٹھ ماہ قبل میری ہونے والی دلھن کے والدین نے میری "منگنی" طے ہونے پر مجھے تحفے میں دی تھی۔

"یہ کیا کرتے ہو؟"

"میرے پاس یقین مانو اس وقت کچھ بھی نہیں ــــ تم اسے کہیں گروی رکھ کر

کام نکال لو۔ پیسے آنے پر پھر آکر مجھے لوٹا دینا۔"

وہ انگوٹھی جیب میں ڈال کر تیزی سے نکل گیا۔ شاید وہ پھر رو رہا تھا۔

وہ جا چکا تو میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

اس سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر سوئے ہوئے فتنے سر اٹھاتے۔ وہ فتنے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس کی اپنی محبتوں سے تھا۔ اس کی اپنی ہنگامہ پرور اور شدید عشق بازی سے تھا اور ان کی چھوٹی بڑی داستانوں سے تھا۔ ان داستانوں سے جو اس کی نوٹ بک کے صفحات میں اختصار کے طور پر حروف تہجی کی صورت میں محفوظ تھیں۔

اسے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء تا ۷ار جون ۱۹۴۹ء ——— اب یہ الف۔ انوری بھی ہو سکتی ہے۔ آنسہ بھی یا کوئی اور۔

"ت" سے ۲۲ر جون ۱۹۴۹ء تا ۱۳ر جنوری ۱۹۵۰ء ——— اس حد تک مجھے معلوم تھا کہ یہ کوئی تہنیت تھی۔ جو واصف کے لیے آئیوڈین پی لینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ اور بعد میں کسی ضلع میں کسی بڑے بیوپاری سے بیاہی گئی۔

"ج" سے ۶ر مارچ ۱۹۵۱ء تا ۱۱ر مارچ ۱۹۵۱ء ——— یہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہ جمیلہ تھی۔ یو۔ پی کے کسی ضلع سے کچھ دن کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد آئی ہوئی تھی اس لیے کہ یہاں اس کے شوہر کے کچھ رشتہ دار تھے۔ جب اس کے شوہر کو کچھ شبہ ہوا تو خود جمیلہ نے واصف کے خلاف اس کے کان بھرے۔ پھر ایک رات کو جمیلہ کے شوہر نے واصف کا گریبان پکڑ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اصف کا کمرہ آٹھ دس دن تک مقفل رہا۔ اس کے ملنے جلنے والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی

کہ وہ اپنے گھر گیا ہے۔ لیکن میں ہاسپٹل میں اس سے ملتا رہا۔

یہ عشق و محبت کی داستانیں الف سے لے کر والسلام تک اس کی نوٹ بک میں بکھری پڑی تھیں۔ جو آج اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بچہ واصف کا نہیں ہے۔ بچہ واصف کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے ان چلاتی ہوئی داستانوں کی چیخ و پکار کو غلط سمجھنے کا کوئی حق ہی نہیں تھا اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ واصف کی پیاس، واصف کی تشنگی، پہلے پہل اس کی محرومی بنی اور پھر اس کا مقدر بن گئی۔

اس نے چھوٹے بڑے کئی عشق کیے۔ اتنے شدید عشق بھی کیے کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ کبھی پاگل نہیں ہوا۔ نہایت احتیاط سے محرومیوں اور ناکامیوں کے درمیان لٹکتا رہ گیا۔۔۔۔ انجام کو جانے بغیر اس نے ہر محبت کی ناکامی پر دوسری محبت کی بنیاد رکھ دی۔

"ش" سے اس نے بے اندازہ، بے پناہ اور طویل المیعاد محبت کی۔ اس محبت میں شاید وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اس محبت اور فتح نے اس کی رگ و پے میں زہر کے وہ نشتر توڑ کر رکھ دیے جن کی کھٹک اور کسک اس کی زندگی کا حاصل ہو کر رہ گئی۔ اس کا نام غالباً سرور جہاں تھا۔ جس نے واصف کو مرد کی طرح عورت کے قریب آنے کا حوصلہ دیا۔ پندار عطا کیا۔ لیکن اس کے بدلے اس نے گھر بھر کی دولت سمیٹ لی۔ اس کا نام نہاد عشق کے ہاتھوں واصف جیل جاتے جاتے بچا۔ اس نے ایک جوہری کو دھوکا دے کر زیور حاصل کیے اور جب قانون نے اس کو اپنے شکنجے میں کس لیا تو اس کی ایک متمول رشتہ دار نے اس کو اس مصیبت سے نجات

دلائی۔

مجھے یاد ہے ان دنوں واصف کا عجیب عالم تھا۔ اس کو جیسے سب کچھ حاصل تھا لیکن کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ سرور کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اور اس خوشی کے حصول میں اس نے اپنی قریب ترین ہستیوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہونچانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کو بس ہمیشہ یہی فکر دامن گیر ہوتی کہ سرور کو کوئی ایسی نرالی چیز تحفے میں پیش کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے۔ اور ان تحفوں کے سہارے اس کی محبت پروان چڑھے۔ اور اس طرح وہ اپنے اس جنسی کاروبار کو محبت کا لفظ دے کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا۔

ان دنوں وہ جب بھی مجھ سے ملتا کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے کوئی ایسی چیز اپنی زندگی سے کھو دی ہے جو سب سے زیادہ اہم تھی لیکن وہ کیا چیز تھی یہ خود واصف کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔

وہ باتیں کرتا کرتا یکایک اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب اس مقام پر اس کا ایک منٹ کا قیام بھی اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے چھین لے گا۔

وہ کہتا "یار۔ والہانہ عشق کرتی ہے مجھ سے۔ ایک پل مجھ سے جدا نہیں رہ سکتی۔"

مجھے واصف کی اس دیدہ دلیری پر ہنسی آ جاتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ واصف بڑی سفاکی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ جو ہر جذبے کا قاتل ہو۔ ایک ایسا جھوٹ جس کے ہاتھوں خلوص مرتا ہے تو پھر زندہ نہیں ہونے پاتا ـــ اور اس کے بعد صرف آدمی کے ساتھ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ واصف اتنا معصوم آدمی نہیں ہے جو سرور جہاں کے والہانہ عشق

اور ہوس کے درمیان خط فاصل نہ کھینچ سکے وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن دھوکا دیتا اور دھوکا کھانے میں اس کو جو لذت ملتی تھی وہی شاید اس کی دانست میں اس کا سب سے بڑا وصف تھا۔

اس طرح جب اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤ لگا کر مطمئن ہو رہا۔ اس لیے کہ اس کا یہ داؤ چل گیا تھا۔ اور وہ سب کچھ ہار کر بھی اس فتح و نصرت پر قانع تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ایک بہت ہی کھاتے پیتے دوست کو جو ایک اونچے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ سرور کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ سرور جہاں کی ہر خواہش کو اپنے دوست کے ہاتھوں مکمل ہوتا ہوا دیکھے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ واصف نے جو راستے اپنے لیے متعین کیے ہیں وہ اس کو ایسی ایسی اندھیری گھاٹیوں میں لے جا سکتے ہیں جہاں نہ صرف ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا بلکہ خود اپنے وجود اور عدم وجود کے احساس ہی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

لیکن وہ ان دنوں مجھ سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی میں نے اس سے ملنے کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش کی۔

ایک رات وہ یکایک آ دھمکا۔ بہت مسرور۔ بہت خوش۔

میں نے کچھ نہ جاننے کے انداز میں پوچھا "س" سے تمھارا عشق کس منزل میں ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ "یار کیا آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہو۔"

میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا بات ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔"

"بھئی "س" سے الگ ہوئے زمانے بیت گئے۔"

"اور تم ابھی تک زندہ ہو"

"ہوں ـــــ دیکھو بالکل ہوں۔ تمھارے سامنے ہوں"

اس نے میرے طنز کے منھ پر اس طرح تھوک دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہو۔

"آخر کس موڑ پر رہ گئی بے چاری"

"موڑ پر نہیں منزل تک پہونچا آیا ہوں"

"تو گویا اس کی منزل اور تمھاری منزل جدا تھی"

"بس یہی سمجھو، سمجھتا تو یہی تھا کہ منزل دونوں کی ایک ہی ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا

میں تو آگے نکل آیا ہوں"

"تو اب کہاں تک جاؤگے"

"بس دیکھتے رہو"

"کسی نئی منزل کی تلاش ہے یا صرف چلتے رہنا ہی مقصدِ زندگی ہے؟"

"تلاش نہیں منزل متعین ہے۔ اسی کی جانب نگراں ہوں اور قدم اٹھا

رہا ہوں"

میں نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

باتوں کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے پنج وقتہ نماز

شروع کر دی ہے۔ عشق کی ساری نئی پرانی داستانوں کا دفتر پارینہ جلا کر پھینک دیا

ہے۔ شہر کے کسی نامی پیر و مرشد کا مرید خاص ہو گیا ہے۔

میں نے اس تبدیلی کا مذاق اڑانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کچھ اس طرح خشوع و خضوع

سے اپنے مرشد کا تذکرہ کر رہا تھا کہ اس کے اس اعتماد کو متزلزل کرنا مجھے گوارہ نہ تھا۔

پھر وہ چلا گیا اور کچھ ہی دن بعد ایک دن مجھ سے راستے میں اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔
میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مکہ مسجد سے نماز جمعہ ادا کر کے چلا آرہا ہے۔
مجھے پتہ نہیں اس کے چہرے پر آج پھر وہ بشاشت کیوں نظر آئی جو کچھ ہی دن قبل میں نے دیکھی تھی۔

"کیوں محبت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں" اس نے اس انداز سے کہا جیسے میرا سوال ہی مہمل تھا۔

پھر خود ہی کہنے لگا۔ "یار میں تمھارے پاس آنے ہی والا تھا۔"

میں نے پوچھا "کیوں خیر تو ہے۔ پھر کسی چکر میں تو نہیں پڑ گئے۔"

"نہیں یار یوں مت کہو۔۔۔ تم بعض وقت بڑا اہانت آمیز انداز اختیار کرتے ہو۔"
میں نے اس قسم کی بات اس کی زبان سے پہلی بار سنی تھی محبت کے تعلق سے اس قسم کا اظہار خیال اس کی شخصیت کا ایک بالکل نیا پہلو تھا جو شاید اس پیری مریدی کا عطیہ ہو۔
میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اچھا بھئی معاف کر دو۔ لیکن بتاؤ تو بات کیا ہے؟"

اس نے پھر اس انداز سے کہا جیسے کسی آیت کا ترجمہ کر رہا ہو۔

"مجھے اپنی ایک پیر بہن سے انس ہو گیا ہے۔"

"اور یہ انس بہت جلد محبت تک جا پہنچے گا۔"

"نہیں یار تم ہمیشہ کی طرح مذاق نہ اڑاؤ۔"

"حقیقت کا اظہار مذاق تو نہیں ہوتا۔"

"لیکن حقیقت کا انداز اظہار اتنا تلخ بھی تو نہیں ہونا چاہیے۔"

چوں کہ ہمارے راستے مختلف تھے اس لیے ہم جدا ہو گئے۔۔۔ اور بات اس سے آگے نہ ہو سکی۔ ویسے میں نے اس کو روکنا بھی چاہا لیکن وہ خود بڑی جلدی میں تھا۔ اس کے بعد وہ ایک بار مجھ سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ اپنی پیر بہن سے اس کا معاشقہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے۔ وہ بڑی پاک اور بے عیب محبت کر رہا ہے۔ ایسی محبت جو ٹھنڈا سایہ تو چاہتی ہے گھنا نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو نشہ تو چاہتی ہے دخترِ رز نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو روح تو چاہتا ہے جسم نہیں چاہتی۔

میں بھلا اس سے کس طرح کہتا کہ اس کی شخصیت کی یہ نئی پناہ گاہیں اسے راس آئیں۔

ایک بار یہی باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی ہتھیلی میری طرف بڑھا دی۔ "دیکھتے ہو؟"

میں نے کہا۔۔۔ "نہیں میں پامسٹ نہیں ہوں۔"

"لیکن اندھے بھی تو نہیں ہو۔"

"اوہ"۔۔۔ میری نظر ہتھیلی کے بیچوں بیچ اس داغ پر جم کر رہ گئی جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

"یہ جو داغ ہے نا اس میں مجھے چاند کی ٹھنڈی روشنی نظر آتی ہے۔ اور یہی روشنی اب میرا مقدر ہے۔"

"یار میں تو سنتا تھا، نماز پڑھنے سے پیشانی پر سجدوں کے نشان ابھرتے ہیں لیکن تم نے تو ہتھیلی پر بہشت بنا دی۔"

وہ پھر برہم ہو گیا۔۔۔ "تمھیں اپنا پرانا طور طریقہ چھوڑ دینا چاہیے۔"

میں نے اس کو ستا لیا۔۔۔ "اچھا بھئی۔۔۔ اب جو کبھی ایسی گستاخی کی تو وہی سزا دینا جو کبھی رجو کے شوہر نے تمھیں دی تھی۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "یار باز بھی آؤ اپنی شرارتوں سے۔"
میں نے اس کو بھینچ لیا۔ "اچھا اب بتا بھی دو کہ آخر یہ نشان ہے کیا؟"
اس نے مجھے بتایا کہ اپنی پیر بہن کے انکار پر اس کا دل جیتنے کے لیے اس نے اپنا پہلا نامۂ محبت جو اس کی پیر بہن نے اس کو سخت سست کہہ کر لوٹا دیا تھا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے ہی آگ لگائی تھی کہ اس کے ہاں کہہ دینے تک وہ اسی طرح اپنی ہتھیلی کو جلاتا رہے گا۔ اور اس کی پیر بہن نے بے قرار و مضطرب ہو کر حامی بھر لی تھی۔ اور اس طرح ہتھیلی کا یہ داغ اس کی بے داغ محبت کا جگمگاتا نشان بن گیا تھا۔

اس کے بعد پھر وہ بہت دنوں تک مجھ سے نہیں ملا تھا۔
اور جب آج ملا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ قرآن سر پر اٹھا کر اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔
اور اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔
اور میں سوچ رہا تھا کہ ـــ آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن آنسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

پھر جب وہ انگوٹھی لے کر جا رہا تھا تب بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ شاید وہ رو رہا ہو۔
اس کے بعد پھر وہ بہت عرصے تک مجھ سے نہیں ملا۔
اس سے بالکل غیر متوقع طور پر میری ملاقات اپنے ایک دوست کے کسی قریبی رشتہ دار کی شادی میں ہوئی۔

وہ بے حد مصروف تھا۔ شادی کے انتظامات اس قدر تن دہی سے کر رہا تھا کہ

واقعی اس کو منٹ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

میں دور بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست سے جس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ استفسار پر مجھے معلوم ہوا کہ دلہن انھیں پیر دمرشد کی صاحبزادی ہیں جن کے ہاتھ پر واصف نے بیعت کی تھی۔

واصف کی مصروفیت کا سبب روز روشن کی طرح میرے سامنے واضح اور عیاں تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑا ہوا، انتظامی امور کے تعلق سے ہدایات دے رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب پہونچا تو اس نے مجھے دیکھا اور اس طرح بالکل اتفاقیہ ملاقات کی مسرت میں مجھ سے معانقہ کیا۔

میں اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا اور سگریٹ جلا کر باتوں کا سلسلہ شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی جلدی سے آکر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔

اس نے بڑے اطمینان سے لفافہ چاک کیا۔ گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر بڑے انہماک سے پڑھنے لگا۔

> میرا جسم خواہ کسی کی ملکیت ہو، میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کی رہے گی۔ یہ انگوٹھی آج تک آپ کی نشانی کے طور پر میرے دل کے ساتھ رہی۔ اب اس کو آپ میری نشانی سمجھ کر اپنی انگشتِ شہادت کی زینت بنائے رکھیے۔
>
> حشر تک آپ کی
>
> "بڑی صاحبزادی"

اس نے جب ٹھنڈی آہ بھر کر انگوٹھی نکالی تو میں پہلی نظر ہی میں پہچان گیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو نہ صرف میری اپنی ملکیت ہے بلکہ میری منگیتر کی نشانی ہونے کے ناطے سے میرا جذباتی لگاؤ بھی جس سے وابستہ ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اس طرح نظریں پھیریں جیسے انگوٹھی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔

واصف خود مجھ سے مخاطب ہوا "پہچانتے ہو اس انگوٹھی کو؟"

میں بس دیکھتا ہی رہ گیا کچھ بھی نہ کہہ سکا ــــ وہ پھر خود ہی کہنے لگا

"یار، ابھی رہنے دو میرے پاس، دو ایک دن میں لوٹا دوں گا۔"

خط اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے مجھ سے پوچھا "جانتے ہو۔ یہ خط کس کا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

کہنے لگا "پیر دستار کی بڑی صاحبزادی کا۔"

"آج انھیں کی تو غالباً شادی ہے" ــــ میں نے مکرر تصدیق چاہی۔

"ہاں بھئی ــــ دلہن بن گئی ہیں لیکن مجھے چھو لینے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکیں ــــ تم نے تو اپنی آنکھوں سے خط دیکھ لیا نا؟"

پھر وہ مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

میں آہستہ سے اس کے پاس سے کھسک آیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کے ساتھ اب ایک لمحہ گزارنے کے خیال سے بھی وحشت سی ہو رہی تھی۔

شادی سے لوٹنے لگا تب بھی اس سے ملاقات نہ ہو لی۔ وہ کسی کام سے اندر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔

پھر وقت کا ایک لمبا دریا اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا.
وہ اب میری طرف بالکل نہ آتا تھا۔
میں نے اپنی شادی میں بذریعہ رجسٹری بطورِ خاص اس کو رقعہ بھیجا۔
وہ پھر بھی نہ آیا۔
اپنی رنگا رنگ نئی زندگی کے سلجھانے اور سنوارنے میں، میں کچھ اس طرح لگا کہ اسے بھول بھال گیا۔
ایک دن راستے پر مجھے کسی جانی پہچانی آواز نے مخاطب کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی نہ تھا۔ آگے بڑھنے لگا تو بالکل برابر سے کسی نے میری بانہہ پکڑ لی۔

"اوہ! تم ہو، یہ ایں ریش و بروت"
میں بدقّت تمام اس کے اس حلیے کو پہچان سکا۔
داڑھی میں اس کا چہرہ پُر وقیع ضرور ہو گیا تھا۔
اس نے کہا۔ "اب میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ چلو، تمھیں تمھاری بھابی سے ملاؤں"
میں نے شکایت کی۔ "شرم آنی چاہیے۔ الگ الگ شادی کر لی مجھے مدعو تک نہ کیا۔ اور پھر میری شادی میں بھی نہیں آئے"
اس نے معافی چاہی۔ کہنے لگا۔ "کیا بتاؤں کیسے کیسے انقلابات زندگی میں آئے ہیں"
میں نے کہا۔ "وہ تو تمھارے چہرے سے ہی ظاہر ہیں"

وہ مجھے گھسیٹنے لگا۔ "چلو بھئی۔"

"بھئی آخر رہتے کہاں ہو؟"

"یہیں ـــــ سامنے، اسی ڈیوڑھی میں۔"

"کیا یہ سسرال ہے تمہاری؟"

"سسرال نہیں۔ میرا اپنا گھر سمجھو۔ یہ بات دراصل یہ ہے کہ ـــــ تمہیں ش تو یاد ہے نا۔"

"ہاں ہاں اچھی طرح یاد ہے۔"

یہ اسی کے میاں کی ڈیوڑھی ہے۔ بس یہیں میں بھی اپنی بیوی سمیت رہتا ہوں ـــــ دوست ہو یا تو ایسا ہو ـــــ ایک پل میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیا نفیس آدمی ہے۔ سرتابہ قدم محبت ہی محبت۔ اس سے زیادہ میری اپنی حکومت اس گھر پر چلتی ہے۔ ش بھی مطمئن ہے اس کا شوہر بھی۔ مجھے بھی ہر طرح کا اطمینان حاصل ہے۔ بس اپنی کتب زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ اس کے سوا مجھے کوئی کام نہیں۔ یہی لوگ میرے کفیل ہوتے ہیں۔ بڑا اعتدار پسند آدمی ہے۔"
ایک سانس میں اس نے اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

باتیں کرتے کرتے ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ زنانہ دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ تو اس نے پھر بانہہ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ "چلے آؤ بھئی۔ تم سے بھلا کون پردہ کرے گا یہاں۔"

صحن سے ہو کر دیوان خانے میں پہنچے تو بیٹھے ہوئے لوگ ایستادہ ہو گئے۔

"ان سے ملو یہ میرے کرم فرما۔ میرے جگری دوست، میرے محسن،

یہ ان کی بیوی ــــ اور یہ میری بیوی کہا ــــ پیر و مرشد کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ حضرت نے مجھے فرزندی میں قبول فرمایا ہے۔"

واصف کی بیوی نے سلام کیا تو اس کی انگلی میں انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

میں نے انگوٹھی سے پھر نظریں پھیر لیں۔

میں لوٹنے لگا تو گیٹ کے باہر تک وہ مجھے چھوڑنے آیا ــــ میں نے کہا "یار تمھاری اس پیر بہن کا کیا ہوا۔ تم نے پھر کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔"

وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

بات بدل کر اس نے کہا۔

"اس کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ سچ ہے نا۔ رہزن ایمان و آگہی۔"

سرگوشی کرنے کے انداز میں جھک کر مجھ سے کہنے لگا۔ "اب بھی کبھی کبھی ملتفت ہو جاتی ہے۔"

"اف" میں جیسے گرتا گرتا سنبھل گیا۔ جب ہوش بجا ہوئے۔

تو میں نے پھر پیر بہن کا تذکرہ چھیڑا اور اندازے پر گولی چلا دی جو ٹھیک اس کے سینے پر لگی۔

"شرماؤ نہیں یار مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔"

"پھر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مکرر اپنے جرم کا اقبال تجھ سے کر دوں۔"

"نہیں بھئی ــــ میں نے تو بس یونہی تم سے پوچھا تھا۔"

"کیا بتاؤں یار ــــ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے اسے اپنے عقد میں لینا چاہتا تھا۔"

"پھر کر کیوں نہیں لیتے عقد؟"

"یار تم بھی عجیب آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہو ـــ اس نے تو انہیں دنوں خودکشی کر لی لیکن میں اب بھی ہر جمعہ کو اس کے نام پر ختم قرآن کرواتا ہوں۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ واصف اپنی بیوی بہن کی قبر پر بیٹھا اسی قرآن کا ورد کر کے اس کے نام پر بخش رہا ہے جس قرآن کو سر پر رکھ کر اس نے کبھی قسم کھائی تھی کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

میں اس لیے اداس نہیں ہوں کہ شہر کی وہ جانی پہچانی سڑکیں، وہ مانوس گلیاں جو دن کو اپنے اجالوں اور شب کو اپنے اندھیروں سمیت میرے قدموں کے نیچے بچھی رہتی تھیں اب میرے قدموں کی چاپ کو ترسیں گی ان کے لمس کو ترسیں گی۔

میں اس لیے اداس نہیں ہوں کہ میرے وہ ساتھی جن کے قدم بہ قدم میں نے زندگی کی جدو جہد میں حصہ لیا ہے اب میرے اپاہج ہو جانے کے باعث مجھے چھوڑ کر آگے نکل جائیں گے۔

میں اس لیے اداس نہیں ہوں کہ اس حادثے نے میری ساری ہستی کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے ماضی کی مضبوط جڑیں میرے حال کی سنگلاخ زمین کے کھردرے سینے میں بے طرح ہل کر رہ گئی ہیں اور اب

میرے مستقبل کی چمکدار دھرتی پر ان کے پا۔ پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔
میں اس لیے اداس نہیں ہوں کہ مجھے ڈاکٹروں نے ابھی نہیں بتایا کہ میرے بیدار ذہن کی جلتی ہوئی لو بجھ نہیں جائے گی، میری عمیق آنکھوں کی شریر کرنیں سرد نہیں پڑ جائیں گی۔ میرا تار نفس، میری زندگی کا رشتہ امید ٹوٹ نہیں جائے گا۔

میں اس لیے بھی اداس نہیں ہوں کہ تم اب کبھی نہیں آئی ہو ۔۔۔ مجھے علم ہے کہ جو جدائی تمھارا اور میرا مقدر ہے اس کے ناطے میں اب ان راستوں کا تصور ہی نہ کروں جن راستوں پر چل کر تم میری یادوں سے بہت دور نکل گئی ہو اور میں جن راستوں پہ آگے بڑھ رہا تھا ان کی سمت اتنی مختلف تھی کہ میرا ہر قدم تم سے مجھے اور دور اور دور کر رہا تھا۔
تمھارا ذکر اب میری زندگی سے صرف اس قدر وابستہ ہے جیسے بے آب گیاہ جنگل میں، کھڑی دوپہر کے وقت ایک بے برگ و بار پیڑ کے نیچے کسی تھکے ماندے پیاسے مسافر کا وجود ۔۔۔ جو پھر بہاروں کا تصور کیے بیٹھا ہو۔
لیکن اس کے باوجود ۔۔۔ تمھارا ذکر پھر تمھارا ذکر ہے ۔۔۔ اور میری زندگی اب میری زندگی نہیں۔

پھر اب میرے پاس اس اداسی کا سبب رہ ہی کیا جاتا ہے ۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میں اداس ہوں۔

بڈ نمبر ۵ پر میں نے جب آنکھ کھولی ہے تو مجھے علم نہیں ہوا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔
بڈ نمبر ۵ پر جب میں نے اپنی آنکھیں دیر تک کھلی رکھنے کے بعد بند کر لی ہیں اسوقت

مجھے احساس ہوا جیسے میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ـــ اور میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔
دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سائیکل جس پر میں سوار ہوں ـــ دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل ـــ دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل۔
اور جب مجھے موت کی گہری کھائی سے زندگی نے کھینچ کر نکال لیا ہے تو میں بہت ہی سہما سہما زندگی کے پیچھے پیچھے پیر دبا کر، سنبھل سنبھل کر بڑی ہی احتیاط سے چل رہا ہوں کہ مبادا اس کو میری کوئی حرکت ناگوار گذرے اور وہ قدم بڑھا کر آگے نکل جائے اور میں لپک کر اس کا دامن بھی نہ تھام سکوں۔
میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔ اجالے اور اندھیرے آپس میں مدغم ہو رہے ہیں۔ پھر جدا ہو رہے ہیں۔ میں کبھی انھیں پہچان رہا ہوں، کبھی نہیں پہچان رہا۔ یہ اجالا ہے۔ یہ اندھیرا ہے۔ یہ اجالا اور اندھیرا دونوں آپس میں مل گئے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔
اب، جب کبھی میں اجالے کو پہچان لیتا ہوں، وہاں ایک چہرہ بھی مجھے دکھائی دیتا ہے۔
میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔
اب اجالے ہی اجالے میرے اطراف پھیل گئے ہیں۔
اب نہ ان اجالوں کو میں جھٹلا سکتا ہوں۔ نہ اس چہرے کو جو اندھیروں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے۔
"آپ نے پہچانا مجھے؟" ـــ

بالآخر اس کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بھی صرف اس حد تک کہ اس کا چہرہ میرے لیے نامانوس نہیں ہے — وہ مریضوں کا یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔
پھر اس نے اپنے تعلق سے مجھے بہت کچھ بتایا۔
کبھی وہ اور میں ایک ہی اسٹیشن پر آمنے سامنے کی بنچوں پر کئی رات سو چکے تھے اجالوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے، اندھیروں کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے مقابل اپنی بنچ سنبھال لیتے تھے۔ میں نے کبھی اس سے قرب کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کبھی مجھے لائق اعتنا نہیں سمجھا۔
پھر ہم ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے جیسے کوئی راہ گیر سگریٹ جلانے کے لیے دوسرے راہ گیر کا ایک تیلی کا احسان اٹھا کر مجوب مجوب جدا ہو جاتا ہے۔
مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کس نے کس سے تیلی مانگی تھی اور — کون کس کا محسن ہے۔
وہ دن میں کتنے ہی بار اپنے بستر سے میرے پلنگ تک آتا رہا۔ مجھ سے کتنی ہی باتیں کیں مجھے تسلیاں دیں۔ میرے تعلق سے جھوٹ موٹ ہی اکسرے سکشن کی امید افزا رپورٹ کا ذکر کیا۔ میرے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میری پسینے سے تر پیشانی سے چپٹے ہوئے بال درست کیے۔
اس کے باوجود میری آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹ کر کچھ تلاش کرتی رہیں۔
میں نے اس سے پوچھا: یہاں ملنے والوں کی آمد کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔
میں نے جس وقت اس سے یہ سوال کیا ہے اس وقت مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔ لیکن میرا دل مسوس رہا تھا ایک ایسا غم آہستہ آہستہ میرے

وجود پر قبضہ کر رہا تھا جس غم کا میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میرے وارڈ کے سارے پلنگوں، سارے بستروں کے اطراف کراہتی اور سسکتی ہوئی زندگیوں کو دلاسہ دینے کے لیے مسکراتے، ہنستے، شاداں و فرحاں چہرے بھی جمع ہو گئے تھے، مغموم اور اداس چہرے بھی ـــــ لیکن میرے پاس سوائے اس کے اور میری اپنی اداسیوں اور محرومیوں کے کوئی نہیں تھا اور اس کے پاس تو پتہ نہیں اس کی اپنی اداسیاں اور محرومیاں بھی تھیں یا نہیں۔

"ملنے والوں کا وقت اب ختم ہوا چاہتا ہے ـــــ آپ کو شاید اس ہنگامے سے الجھن ہو رہی ہے۔"

میں نے اس کو جواب میں کچھ بھی نہ کہا ـــ لیکن میری آنکھیں بڑی کس مپرسی کے عالم میں ایک ایک چہرے کو تک رہی تھیں۔

وہ کیوں نہیں آیا ـــ

وہ بھی تو آسکتے تھے ـــ

اور ہاں وہ بھی تو ـــ

لیکن کوئی بھی تو میرے لیے نہیں آیا تھا ـــ

ہاسپٹل کے باہر بکھری ہوئی شام کی اداسیاں رات کی پھیلی ہوئی سیاہ چادر میں سمٹ رہی تھیں۔

ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا تھا۔

ہاسپٹل کے اندر بجلی کی روشنیاں۔

لیکن ہاسپٹل کے باہر ٹھہری ہوئی رات کا اندھیرا میرے اطراف پھیلی ہوئی

بجلی کی روشنی سے بچ بچ کر چھپ چھپ کر جانے کس طرح میرے سینے میں داخل ہو رہا تھا۔
"آپ اسقدر اداس کیوں ہو گئے ہیں بھٹ" اُس نے آخر مجھ سے پوچھ ہی لیا۔
"آپ اس قدر اداس کیوں ہو گئے ہیں؟" میں نے اس کے سوال کو
نظر انداز کر کے اسی سے سوال کیا۔
وہ مسکرایا بلکہ قریب قریب ہنس پڑا ـــــ پھر کہنے لگا۔
"بھاگتی اور دوڑتی ہوئی زندگیاں، ہمیشہ بوجھل اور مضمحل زندگیوں کو پیچھے
چھوڑ دیتی ہیں۔"
"ٹھیک ہے ـــــ لیکن پیچھے پلٹ کر کبھی کبھی دیکھ لینے میں بھی تو کوئی حرج
نہیں" ـــــ
"ہاں ـــــ لیکن کون دیکھتا ہے۔"
"جو نہیں دیکھتے ہیں ان کا سوال نہیں۔ لیکن جنھیں نہیں دیکھا جاتا وہ تمنا تو
کر سکتے ہیں۔"
"یہ تمنا ہی پوری نہ ہو تو ایک اور راستہ بھی نکل آتا ہے۔" اس نے بہت ہی
رکتے رکتے یہ بات کہہ دی۔
"میں سمجھا نہیں ـــــ میں نے کہا۔ میرے ذہن میں کوئی ایسا راستہ نہیں ہے۔"
"یہی کہ ہم خود دوسروں کی تمنا پوری کریں ـــــ بالکل اس طرح جیسے آنکھیں
بند کیے ضد کو منا رہے ہوں۔"
"تو آپ یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی کر رہے ہیں؟"
"میں بالکل آپکے ساتھ کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ نے فی الواقع نہیں سمجھا۔

میں کہہ چکا ہوں۔
—— اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔
پھر میں نے اس کو ہمیشہ تم کہا اور اس نے مجھ کو۔
دوسرے دن شام کو جب ملاقاتیوں کا وقت شروع ہوا تو کتنے ہی جانے پہچانے چہرے میرے اطراف تھے۔
کوئی مجھ سے کل کے نہ آسکنے کی معافی مانگ رہا تھا۔
کوئی مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اسے آج ہی معلوم ہوا ہے۔
کوئی مجھی سے پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹر لوگوں نے کیا کہا۔
کوئی حادثے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔
میں اتنے بہت سارے پوچھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہی نہیں مغرور ہو رہا تھا فخر محسوس کر رہا تھا۔ انھیں سب میں وہ بھی تھا۔
کبھی مجھے دیکھ رہا ہے کبھی سرے دیکھنے والوں کو اور ایک مستقل مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہوئی رکھی جیسے کسی نئی نویلی دلہن کے لبوں پہ مسی کی دھڑی۔
پھر وہ کہیں غائب ہو گیا۔ جب سب لوگ جا چکے تو میری آنکھیں اس کی متلاشی تھیں۔
آج ہاسپٹل کے باہر شام کی اداسیاں بکھری ہی نہیں بلکہ شاید شام ہی نہیں ہوئی۔
آج ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا چھانے سے پیر دبا کر آیا اور بکھر گیا

سے جھانکتی ہوئی روشنیوں سے نظر بچاتا کنج کنج میں چھپتا پھرا ——

"آج تو تم مطمئن ہونا" —— وہ میری بائیں سے نمودار ہوا۔

"کیوں؟" —— میں نے دانستہ پہلو تہی کی۔

"آج جو اتنے بہت سارے لوگ تم سے ملنے چلے آئے تھے"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کا قصوروار ہوں۔ اور کل جو اس سے میری باتیں ہوئی ہیں اس کا احساس میری مسرتوں پر کچھ اس انداز سے پہرے بٹھا رہا ہے کہ میں رفتہ رفتہ اپنے ملنے والوں کی آمد پر خوش بھی نہ ہو سکوں گا۔ لیکن رفتہ رفتہ خود میرے ملنے والوں ہی نے نہیں دوست احباب نے بھی آنا چھوڑ دیا۔

—— اور اب میں بالکلیہ اس کے حوالے ہو کر رہ گیا۔

اس کے دائیں پاؤں میں لنگ تھا اور اس کا بایاں ہاتھ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دواخانے کے پائیں باغ میں صبح و شام چہل قدمی کرے۔ یہ چہل قدمی اس کے معذور پیروں میں خون کی گردش اور روانی کے لیے ضروری تھی —— وہ ویسے بھی دن بھر اپنے بستر پر کم ہی رہتا۔ صبح صبح وہ باغ میں چہل قدمی کر کے لوٹتا تو اپنے بستر کے پاس ناشتہ مل جاتا۔ اس کے بعد وہ وارڈ وارڈ گھوم کر ان سب کی خیر خیریت پوچھ آتا جن سے ہاسپٹل میں وہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ اور اس خیر خیریت پوچھنے کا آغاز وہ بیڈ نمبر ۵ کے مریض سے یعنی مجھ سے کرتا —— یہ اس کی اپنی دانست میں آنکھیں بند کیے ہوئے نیند کو منانے کی ادا تھی۔ اور یہ ادا پتہ نہیں اس کو کس قسم کا

آرام بخشتی تھی۔ میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ آنکھیں کھول کر سونے کا یہ سلیقہ اس لیے اسے آگیا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے جاگتے رہنے کا سلیقہ بھی جانتا ہے میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کوئی اس کا اپنا حال احوال پوچھنے کے لیے اس کے بستر تک آتا ہو ۔۔۔ وہ دوسروں سے ہمدردی کر کے ان کی تمنا پوری کرتا ہوگا یا خود اپنی ۔۔۔ لیکن اس کے خلوص اور محبت کے تعلق سے اس طرح سوچنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

اگر یہ اس کی اپنی تمنا ہی تھی تو کیسی چھوٹی سی تھی یہ تمنا، کتنی ننھی سی، کومل سی، اتنی سی ۔۔۔ پھول کی پنکھڑی کی مانند، ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی مانند۔ چھوٹی سی ایک سیپ کی مانند جس کے اندر کوئی گوہر نہیں ہو۔ اس ننھے سے دیے کی مانند جو اندھیری رات کو کسی وسیع و عریض جنگل میں ٹمٹما رہا ہو۔

بھلا مسافر اس روشنی سے راستہ پا سکیں گے ؟۔

وہ اِدھر اُدھر چکر کاٹ کر پھر میرے پاس آجاتا۔

آئس کریم۔ سنگترے۔ موسمبی۔ انجیر کچھ نہ کچھ میرے لیے لے آتا۔

میں کچھ تکلف سے کام لیتا تو وہ برہم ہو جاتا۔ وہ جب کبھی آئس کریم لے آتا تو میں تکلف کم ہی کرتا۔ اور وہ بڑے چاؤ سے میرے کھلے ہوئے منہ میں چمچے بھر بھر کے ڈالتا رہتا۔ پہلے چمچے پر ناگوار ٹھنڈک کے احساس سے جب میں منہ بناتا تو وہ بڑا محظوظ ہوتا اور میرے ساتھ ساتھ خود بھی منہ بنا کر میری نقل کرتا۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”کاموں میں کہتا تھا کہ تم اس لونڈے کے تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ وہ بڑا نیک لڑکا ہے“۔

"پھر کون ہو سکتا ہے تمہارے اپنے خیال میں؟"

"میرے اپنے خیال میں تو میں ہی ہو سکتا ہوں۔"

"نہیں یار، تم مدد کرو میری۔" مذاق بہت ہو چکا۔

"تم رپورٹ کیوں نہیں کر دیتے؟"

"میں چاہتا ہوں خود اس دلچسپ آدمی کو پکڑوں۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس سلسلہ کو جاری ہی کیوں نہ رہنے دوں۔ ایسی کون سی بڑی رقم لے لیتا ہے وہ۔"

"پھر بھی یار، روزانہ کا ٹیکس جو لگ گیا ہے۔"

میں نے کہا "ایسا کون سا بڑا ٹیکس ہے — ہو گا کوئی ضرورت مند۔"

"چار آنے سے زیادہ لیتا ہی نہیں وہ؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ کبھی نہیں۔ آپ دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر رکھ دیجئے وہ ایک چونی لے گا۔ آپ صرف چونی رکھ دیجئے۔ وہ چونی لے لے گا۔"

تم نے زیادہ سے زیادہ کتنے پیسے تکیے کے نیچے رکھے ہیں؟"

"۲۱ روپے ساڑھے بارہ آنے۔"

"اور جب صبح ہوئی۔"

میں نے بات کاٹ کر جملہ پورا کیا۔ "تو صرف چار آنے غائب تھے۔"

"پہلے یہ بتاؤ تمھیں اس لڑکے پر شبہ کیوں ہوا؟"

میں نے اس کو بتایا کہ جس رات یہ لڑکا میرے پلنگ کے برابر والے بستر پر آگیا تھا اس کے پہلے ہی دن اس نے مجھ سے دو آنے مانگے جو میں نے اس کو

دے دیئے۔ دوسرے دن اس نے پھر مانگے۔ میں نے پھر دے دیے۔ تیسرے دن اس نے پھر اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا دیا تو میں نے اس کو ڈانٹا کہ اس طرح مانگنا بری بات ہے ـــــ بس اس کے دوسرے ہی روز سے چار آنے کا ٹکس لگ گیا مجھے۔

"اور کیا پھر اس نے کبھی پیسے نہیں مانگے؟"

"ہاں یہ بات تم نے ٹھیک کہی" میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دو ایک بار اس نے مانگے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ یہی بات میں نے اس کو بتلا دی۔

"حیرت ہے!" اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

"لیکن تمھیں کیوں اس کی پارسائی کا یقین ہے" میں نے اس سے پوچھا۔
صرف مجھے ہی نہیں۔ دوسروں کو بھی ہے اور تم سنو گے تو تمھیں بھی ہو جائے گا۔

فطری طور پر میں نے دلچسپی لی اور اس نے مجھے بتایا کہ بیڈ نمبر ۹ کے مریض نے دس روپے اور کچھ ریزگاری باتھ روم میں چھوڑ دی تھی جو اس لڑکے کے ہاتھ لگی اور اس نے متعلقہ نرس کے توسط سے اس تک پہونچا دے۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا" اس میں یقیناً چار آنے کم ہوں گے"
وہ ہنسا، یار تم بھی کمال کرتے ہو۔ کم ہوتے تو وہ شخص بار بار پرس نہ کرتا۔
کوئی ضروری نہیں ہے۔ وہ یہ جان کر بھی خاموش ہو سکتا ہے کہ چار آنے کی کمی کا اظہار خود اس کی اپنی پوزیشن کو خراب کر دے گا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ

لڑکے کی شرافت پر اس کو کچھ نوازنے کی بجائے اسلئے چوری لگا دی۔
"بھئی خوب دور کی کوڑی لائے ہو"
میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔
اس دن سے وہ بھی اس لڑکے پر نظر رکھنے لگا۔

ایک دن وہ میرے لیے میرا مرغوب پلم کیک لے آیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ اور دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔
میں نے اس کو بتایا کہ آج ٹکس مجھے معاف کر دیا گیا۔
"چلو چھٹی ہوئی" وہ ہنسنے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا "یہ کچھ زیادہ اچھا بھی نہیں ہوا یار"
"کیوں"۔ میں نے پوچھا۔
"اس لیے کہ راز راز ہی رہ گیا۔ جو افشا ہو جاتا تو اچھا تھا"
"یہ بات تو ہے" میں نے بھی اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔
لیکن دوسری صبح پورے آٹھ آنے غائب تھے۔ اور پچھلا ٹکس بھی گویا اس طرح وصول کر لیا گیا تھا۔
میں نے اس کو بتلا دیا اور ہم دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔
اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آج وہ اس بات کا پتہ چلا کر ہی رہے گا۔ خواہ اسے رات بھر جاگنا ہی کیوں نہ پڑے۔
رات خود میرے اپنے تحت الشعور نے شاید مجھے ٹھیک سے سونے نہیں دیا۔ لیکن چور کا پتہ چلانے میں ہم دونوں ہی ناکام رہے۔

دن کو وہ حسب معمول آیا تو چاکلیٹ کا آئس کریم بار بڑی احتیاط سے پلاسٹک کے چھوٹے سے لفافے سے نکال کر اس نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

میں نے کہا "یار تمھاری اتنی ساری محبتوں کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا؟"

وہ بڑی معصومیت سے شرمایا۔ کہنے لگا، نہیں یار تم ایسی باتیں مجھ سے مت کیا کرو۔ تمھاری اس غیریت سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور تم پتہ نہیں مجھے کیا کیا سمجھتے ہو۔ میں اتنا اچھا آدمی بھی نہیں ہوں ـــ تمھیں بتادوں ـــ بتادوں تمھیں ؟ ـــ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

پھر کہنے لگا، خیر چھوڑو۔ "لیکن یار جی چاہتا ہے تم سے لپٹ کر خوب رو لوں۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے پھر اس سے پوچھا "تم کچھ کہتے کہتے کیوں رک گئے ہو؟"

"نہیں ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے۔"

"آخر کہو نا۔"

"میں کل جا رہا ہوں۔ کل ڈسچارج کر دیا جاؤں گا۔"

میں نے نرس کو بلا کر اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب میں زخمی ہو کر آیا تھا تو اس نے اپنا پلنگ میرے لیے خالی کر دیا تھا اور بڑی خوشی سے خود نیچے رہنے پر رضامند ہو گیا تھا۔

اور وہ دوسرے دن چلا گیا۔

آج پھر میرے دل کا عجیب حال ہے۔ میں اس روز بھی اتنا اداس نہیں تھا جس روز کس مپرسی کے عالم میں پہلے دن ہاسپٹل میں پڑا تھا اور مجھ سے ملنے

کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔

میری آنکھیں مجھے یاد نہیں ایسے میں کبھی بھیگی تھیں جب کہ کوئی جدا ہوتا ہے
پھر آج مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔

جی چاہتا ہے وہ آئے اور میرے منھ میں آئس کریم ڈال کر خود منھ بنائے
اور میری نقل اتارے۔

وہ مسرت جو اس کو ایسا کرنے میں حاصل ہوتی تھی مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ
در اصل وہ میری اپنی مسرت بھی تھی۔

اور اب شاید اس نے اپنا یہ فرض میرے سپرد کر دیا ہے کہ میں آنکھیں بند
کیے ہوئے نیند کو مناتا رہوں۔

دوسرے دن میں نے دیکھا پیسے برابر تھے۔ وہ مجھے یاد آیا۔
تیسرے دن میں نے دیکھا پیسے برابر تھے وہ مجھے بے طرح یاد آیا۔
چوتھے دن میں نے دیکھا پیسے برابر تھے وہ آنسو جو میں نے اس کے جاتے
وقت اپنی آنکھوں میں بہ دقت چھپا رکھے تھے وہ آج تکیے کے نیچے پڑی ہوئی ریزگاری
پر گر گئے ہیں۔

نُچا ہوا البم

یہاں ایک چھوٹی سی احاطے کی دیوار تھی۔ یا پھر ہری بھری ترشی ہوئی باڑھ تو تھی ہی، اور یہ دیوار یا باڑھ پکی سڑک سے متصل تھی لیکن آج سڑک پکی ہو گئی ہے، اور احاطے کی دیوار یا احاطے کی باڑھ کچھ بھی نہیں رہی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسافر بنگلے کو سڑک کے قریب سے زمانے نے جبراً گھسیٹ کر دور کر دیا ہے۔

موٹر آگے بڑھ گیا تھا تو میں نے اس مقام کو پہچانا بھی نہیں، پھر کسی نے بریک لگا دی۔ وہ یاد جو چھپی ہوئی کہیں میرے دل و دماغ میں سو رہی تھی اِس وقت چونک کر اٹھ بیٹھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی مسافر عین اس وقت سفر میں بیدار ہو جاتا ہے جب کہ ٹرین اس کی منزل سے آگے گزر رہی ہوتی ہے۔

پچھلی جیپ کار کے ایک شکاری نے مجھے ٹوکا جس نے دونالی بندوق اپنے کندھے پر رکھ لی تھی، اور سینے پر اتنے ٹوٹے آویزاں کیے ہوئے تھا کہ انھیں دیکھنے

سے گھائل ہرنیوں کا خیال آتا تھا، پتھرائی آنکھوں کا خیال آتا تھا، ایک ہچکی کا خیال آتا تھا، ایک اکھڑتے ہوئے سانس کا خیال آتا تھا۔ اور میں نے اطراف یادوں کی جو رنگا رنگ محفل سجا رکھی تھی وہ ان تصورات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے اس سے ... سے کہا۔ "بریک میں نے نہیں لگائی۔"

"پھر آپ ہی تو کار چلا رہے تھے۔"

"مجھے کب انکار ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کار چلا رہا ہو بریک لگانا بھی اسی کے بس میں ہو۔"

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ "کیا بات ہوئی ؟"

"بات یہ ہوئی کہ کار چلاتے وقت آپ کار ہی کی طرح متحرک نہیں ہوتے ہیں۔ آپ کا ذہن آپ کو کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔ جس منزل کے لیے آپ روانہ ہوتے ہیں، اس منزل کو کبھی آغاز سفر سے پہلے ہی جا لیتے ہیں۔ اور جب منزل پر پہنچتے ہیں تو منزل ہی کے تصور میں منزل پہچانی نہیں جاتی۔ ایسے میں کوئی چپکے سے نکل آتا ہے جو کہیں دل میں چھپا ہوتا ہے اور بریک لگا دیتا ہے — بتائیے، وہ بھی تو میں ہی ہوتا ہوں جسے خود میں بڑی مشکل سے پہچان پاتا ہوں۔"

وہ مسکرایا، کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں رات کے سناٹے میں، غنودگی کے عالم میں آر۔ ڈی۔ ڈی کی پکی سڑک پر اپنی جیپ دوڑاتا رہتا ہوں، لیکن ان مقامات پر، جہاں سے مجھے "انٹیرز" میں جانا ہوتا ہے، میری جیپ کے پہیے جیسے خود بخود جام ہو جاتے ہیں اور گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھتی ... اور کے ۔۔۔!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور اس کی جیپ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

وہ سارے درخت جیسے کے ویسے ہیں، گھنے گھنے، گمبھیر گمبھیر چپ چاپ، بادل کی حصار اب پتھر دل سے پکی کر دی گئی ہے۔ میں مسافر خانے کے احاطے میں داخل ہو گیا ہوں جس کو نہ اب دیوار محصور کیے ہوئے ہے نہ ترشی ہوئی باڑھ۔ مسافر بنگلے کی پچھلی جانب وہ گیٹ جوں کا توں کھلا ہے جس سے ہو کر مجھے ریل کی پٹریوں تک جانا ہو گا۔ پھر ان پٹریوں کو عبور کر کے میں پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں گا۔ پھر اسٹیشن کے احاطے سے نکل کر میدان میں آجاؤں گا۔ پھر اس کے بعد سیدھی سڑک، اور یہ سڑک مجھے اپنے بچپن تک لے جائے گی۔

میں نے اپنی فریرز کار بڑے جتن سے اس درخت کے نیچے ٹھہرا دی ہے، جس درخت کے نیچے میں گھنٹوں بیٹھا جانے کیا کیا سوچا کرتا تھا۔

میں نے مسافر بنگلے کے خادم کو اشارہ کیا۔ اور اس کے بنگلے کے دریچے اور دروازے اس طرح میرے لیے کھول دیے جیسے یادوں کی گٹھریاں کھول کھول کر رکھ رہا ہو۔

"صرف ایک ہی کرسی اور وہ بھی اس طرح ٹوٹی ہوئی!؟"

"نیا فرنیچر کچھ ہی دن میں سپلائی ہونے والا ہے صاب!"

"اور یہ پلنگ کیوں غائب ہیں؟ لٹنگ تو بالکل نئی اور مکمل معلوم ہوتی ہے"

"کنکشن بھی آگیا ہے صاب۔ بلب بھی بس آج کل ہی میں سپلائی ہونے والے ہیں"

لیکن سفید سفید لپی لسی گدلائے ہوئے ملتیوں کی خوابناک فضا میں سارا بنگلہ اس طرح سانس لینے لگا جس طرح میرے اطراف سجی ہوئی یادوں کی ایک چھوٹی سی دنیا میں میرا اپنا وجود سانس لے رہا تھا۔

مجھے مسافر بنگلے کی وہ راتیں یاد آئیں جب فانوس میں جلتی ہوئی کسی موم بتی کو میرے نرم ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر فانوس سے جدا کر دیتے تھے۔ اور پھر موم بتی کے گرم آنسوؤں کی حدت میں کبھی اپنی انگلیوں پر، کبھی اپنی ہتھیلی پر، کبھی اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کرتا تھا۔ مجھے موم بتی کے ان اشکوں کو جمع کرنے کا عجیب شوق تھا، جو سرد ہو کر موتی بن جاتے تھے۔ اپنے سیدھے ہاتھ کی اوٹ سے کلپتے ہوئے شعلے کو چھپائے، بائیں ہاتھ میں موم بتی کے گداز جسم کو تھامے میں جب میز کی سطح پر پچھلی رات بہائے ہوئے اس کے اپنے اشکوں کے نشانات تلاش کرتا تو وہ سسک سسک کر آنسو بہاتی۔ یہاں تک کہ اس کا وجود اشک بن کر بہہ جاتا۔ اور پھر یہ آنسو موتیوں کی طرح چن لیے جاتے۔ اور میری خوبصورت سی ڈبیا میں محفوظ ہو جاتے، جنھیں میں شامی کو تحفے کے طور پر دیتا اور وہ ان موتیوں سے کھیلتی۔

اس وقت شامی میرے ساتھ ہے، ہمارے تینوں بچے بھی ساتھ ہیں۔

شامی مجھ سے کہتی ہے۔

”آپ یہاں آ کر کچھ کھو سے گئے ہیں۔“

شامی سچ ہی تو کہتی ہے، میں اسے نہیں جھٹلاتا ہوں۔

”تم لوگ ذرا ستا لو، میں بستی میں گھوم آؤں۔“

”تنہا کیوں جائیے گا۔ چلیے موٹر ہی پر چلتے ہیں۔“

”تم سو بھی لو۔ اس موسم میں چہل قدمی کا لطف اور ہی ہے۔“

وہ برساتی میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ اور بچوں کے ساتھ مسافر بنگلے کے برآمدے میں چلی جاتی ہے۔

چھوٹو مجھے ٹوکتا ہے۔ ساتھ چلنے کے لیے ضد کرتا ہے۔ شامی اسے پچکارتی ہے" اور میں چپکے سے نکل جاتا ہوں۔ مسافر خانے کا پچھلا گیٹ پار کرنے کے بعد میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ شامی چھوٹو کو شنٹنگ کرتی ہوئی مال گاڑی دکھلا کر بہلا رہی ہے۔

میں ریلوے لائن پار کرکے پلیٹ فارم پر پہونچ گیا ہوں۔ یہاں مجھے میرا اپنا بچپن مل گیا ہے جیسے وہ برسہا برس سے میرا منتظر تھا۔ میں بڑھ کر اس کو تھام لیتا ہوں لیکن وہ ضد کرتا ہے۔ میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ وہ پھر بھی ضد کیے جاتا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے ـــ وہ میری آنکھیں میچ دیتا ہے۔ میں اس کی ضد کا سبب سمجھ لیتا ہوں اور آنکھیں بند کیے اسی کی آنکھوں کے سہارے آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ وہ مجھے راستہ دکھاتا جاتا ہے۔

سیدھی جانب یہ جو ہاسٹل کی عمارت ہے یہ بالکل حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔ میرا بچپن جس کی آنکھوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ خود اس عمارت کو نہیں پہچانتا وہ مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے۔ میں پلیٹ فارم پر تمہارا اس وقت سے منتظر ہوں جب کم عمری میں تم مجھے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے پھر کبھی بستی کا رُخ نہیں کیا ہے لیکن پھر بھی میں تم سے زیادہ ان راستوں سے مانوس ہوں۔

یکایک وہ موڑ آگیا ہے جس موڑ پر بھوت رہتے تھے۔ چڑیاں رہتی تھیں۔ سڑک سے چکر کاٹ کر گزرنے کی بجائے فاصلہ کم کرنے کے لیے ہم اسی موڑ سے ہو کر گزرتے تھے۔ مکانوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی، دراصل یہ ایک چھوٹا سا ویران میدان ہے جس کو نیم اور پیپل کے گھنے قدآور درختوں نے اپنے سایوں میں چھپا رکھا

ہے بستی سے نشیب میں ہونے کے باعث اطراف کا بہتا ہوا برساتی پانی یہیں آکر خانہ بدوشوں کے قافلوں کی طرح ٹھہر جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ قافلے اپنا سفر جاری رکھنے کی سکت کھو بیٹھتے ہیں جو مستقل طور پر بھوت پریت کے ہاتھوں مقیّد ہو کر یہیں کے ہو رہتے ہیں۔ گاؤں کے اکثر سوَرکنا، دل کی گپھڑ میں طبقاتی نظام کے خلاف کانفرنس کرتے ہیں۔ چھوت چھات کے مسئلہ پر گرماگرم بحث کرتے ہیں۔ اور پھر کیچ ہی میں سو رہتے ہیں۔ اس آسیب زدہ میدان کی ذی روح مخلوق یہی ہو اس میدان کی ساری زمین سیلی ہوئی ہے۔ نم ہے۔ میں، شامی اور دوسرے بچے اس میدان میں سے بٹ ٹٹ بھاگ کر سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچتے ہیں۔ اور پھر ادھر سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ چہرے سب کے تمتمائے ہوئے ہیں۔ شامی تو بس لال لال ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے جب میں میدان کے بیچوں بیچ پہونچا تھا تو میرے انگ پر کانٹے آگئے تھے ۔۔۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تیسرے درخت کی سب سے نچلی شاخ کے پاس سسکیوں کی آواز سنی ہے۔ کوئی اضافہ کرتا ۔۔۔ وہ دیکھو۔ یہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ غائب ہو گیا ۔۔۔ شامی میرے پیچھے چھپ جاتی۔ پھر ہم گاؤں کی فصیل کی طرف بڑھ جاتے۔

میرا بچپن مجھے اس آسیب زدہ میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ اور سڑک کے کنارے میرا منتظر ہے۔ میں ایک درخت کو تک رہا ہوں۔ اس کے گھنے سائے کو تک رہا ہوں۔ زمین کی وہی سیلن اور آج بھی جوں کی توں ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی کے کناروں کی کیچ پر آج بھی خنزیر جمع ہیں۔ لیکن وہ آسیب

کہاں چلے گئے۔ وہ چڑیلیں کہاں چلی گئیں۔ جو میرے بچپن نے اپنی دلچسپی کے لیے اس میدان میں بسا رکھے تھے۔ بس ایک ویرانی سی آج بھی اس مقام پر مسلط ہے۔ فصیل کے قریب سڑک کی دونوں جانب کچھ دوکانوں کا اضافہ ہو گیا ہے ایک ٹیکسی سائیکل کی دوکان، ایک آٹے کی گرنی، ایک موچی کی دوکان جو صرف چپل بناتا ہے۔

میں فصیل کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ یادوں کی ایک دنیا اپنے سینے میں بسائے ہوئے۔ فصیل کے دروازے میں دونوں جانب سائبانوں کے نیچے آج بھی وہ تخت جوں کے توں پڑے ہیں۔ جن پر نوبت نواز بیٹھتے تھے۔ ایک تخت پر ایک بڑا سا قلم بٹھایا گیا ہے۔ جس کے سامنے انگیٹھی میں عود جل رہا ہے۔ اس کے مقابل کے سائبان میں آدھے تخت پر پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی دکان لگائی گئی ہے۔ آدھا تخت پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور کوئی گھاس کا چولھا پھونک رہا ہے۔

میرے کانوں میں نفیریاں اور نوبت بج رہی ہے۔ میں سر جھکائے فصیل کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا ہوں۔ سر اٹھاتا ہوں تو سامنے بستی کی شاندار جامع مسجد پر نظر پڑتی ہے جس میں آج بھی پولیس چوکیاں قائم ہیں لیکن وہ عظمت کہاں!

میں بڑھتا رہتا ہوں کہ کوئی میرے قدم تھام لیتا ہے۔ میں بائیں جانب مڑ جاتا ہوں۔ یادوں کی اس دنیا میں جو میرے ذہن و دل میں بسی ہوئی ہے ایک ہنگامہ سا ہو جاتا ہے۔ میرا بچپن ایک ایک تصویر میرے البم میں سے دردی سے کھینچ کر نکال رہا ہے اور میرے اطراف تصویریں ہی تصویریں بکھر گئی ہیں۔

شبو نے کرکٹ کا بلا پوری طاقت سے گھمایا ہے۔ میں نے وکٹ کے پیچھے اس کی گیند پکڑ لی ہے اور اس کو اسٹمپ کرنے کی کوشش میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ سارے ساتھی میدان سے فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک بھگ دوڑ مچ گئی ہے۔ چپراسی صیغہ دار سب ہی دوڑ پڑے ہیں۔ ابا بھی اپنے اجلاس کے ٹھاٹھ باٹ اور رعب داب بھول بیٹھے ہیں۔ ان کی متین اور سنجیدہ چال، جس کے بستی بھر میں چرچے تھے۔۔۔ ان کا پر تمکنت انداز خرام جس کی لوگ باتیں کرتے تھے سب دھرا کا دھرا رہ گیا ہے۔ اور وہ بے تحاشا مجھ تک پہونچنے کے لیے باندازِ دگر آ رہے ہیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو بہتوں نے بتلایا کہ شامی کے آنسو ایک لمحے کیلئے خشک نہیں ہوئے۔ شامی آئی تو مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھا۔ کہنے لگی "میں بہت روئی تمھارے لیے"

"تو کون سی بہادری کی بات ہوئی" میں نے اپنی خوشی کو چھپا کر کہا جو جانے کیوں مجھے شامی کے رونے کی بات سن کر ہوئی تھی۔

"تو کون تمھیں بہادری بتاتا ہے جی" وہ جھگڑنے لگی۔

میں نے اس کو پھر چھیڑا۔ "پھر اتنے بہت سارے آنسو کیا کر دیے تم نے؟ لاؤ مجھے دے دو نا!"

"کیا کرو گے لے کر؟"

"اسی ڈبیہ میں رکھ لوں گا جس میں موم کے آنسو تمھارے لیے جمع کرتا ہوں"

"میرے آنسو موم کے آنسوؤں کی طرح ہاتھ نہیں لگنے کے" وہ ہنسی اور بھاگ گئی۔

کیسی کیسی یادیں۔۔۔ مدارس کی پٹاری سے سر اٹھا کر پھن پھیلائے جھومنے والی ناگنوں کی طرح صرف جھوم نہیں رہی تھیں ڈس بھی رہی تھیں۔

میں بستی کی سب سے اونچی عمارت کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ ابّا کا دفتر تھا۔ اب یہاں ضلع پریشد ہائی اسکول ہے۔ تعطیل کے روز جب کہ دفتر بند ہوتا تھا، ہم بچے جی بھر کے اودھم مچاتے تھے۔ گھنے گھنے نیم کے پیڑوں کے نیچے بکھری ہوئی پکی پکی نبولیاں چن لی جاتی تھیں۔ پھر دوکانیں سجتی تھیں۔ لیکن اس دوکانداری میں میرا حصہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نیم کی شاخیں ہلا کر پکی نبولیاں اپنے چھوٹوں کے لیے جھاڑ دیتا۔ یعنی میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ہاتھ بڑھا کر کسی مغرور شاخ کو جھکا دینے میں آدمی بڑائی کرتا ہے۔

ضلع پریشد کے اس ہائی اسکول میں، جہاں اب بے شمار ننھی ننھی زندگیاں کومل ذہن، ناپختہ شعور اور پختہ ارادوں والے نوعمر اپنے مستقبل کے بنانے اور سنوارنے میں کوشاں ہیں وہیں میرا ماضی بھی کسی گوشے میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے زندگی کے اپنے اس سفر میں کیا کیا کھویا ہے۔ اور کیا کیا پایا ہے، اس سے میرے اس کھلنڈرے بچپن کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تو مجھ سے اسی بانکپن کے ساتھ ملتا ہے لیکن میں جانے کیوں ایک کھنکتی ہوئی ہنسی بھی اس کی نذر نہیں کر سکتا ہوں۔ اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔

یہ ہمارا مکان ہے۔ میں مکان کے صدر دروازے تک آ پہنچا ہوں۔ صدر دروازہ جیسے صرف میرے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ میرا اشتیاق کس قدر بڑھ گیا ہے۔ مگر میں اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل ہو رہا ہوں۔ جیسے کسی دوسرے کے گھر میں کوئی سب سے زیادہ قیمتی شے تلاش کر رہا ہوں جو گم ہو گئی ہے۔ در و دیوار مجھے حسرت سے تک رہے ہیں یا میں انھیں حسرت سے تک رہا ہوں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حسرت میں شریک ہیں۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوں، یادوں کے اس جھرمٹ میں کسی کو نظروں سے گدگداتا ہوں۔ کسی سے

نظریں چراتا ہوں اور آگے بڑھتا بڑھتا آہستہ آہستہ اس دروازے تک آپہونچا ہوں جہاں سے مجھے اپنے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونا ہے۔ لیکن دروازے پر قفل لگا ہے۔ میں تڑپ کر رہ گیا ہوں، جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے سینے سے جھپٹ لے۔ کاش یہ دروازے ایک بار میرے لیے کھل سکتے۔ یہ باہیں ایک بار میرے لیے وا ہو سکتیں۔ پتہ نہیں میں پھر کبھی اِدھر آبھی سکوں گا یا نہیں۔ میں اپنی آنکھیں دروازوں سے لگا دیتا ہوں، لیکن کوئی روزن، درز نہیں جو مجھے اندر کی خاموشیوں میں بسی ہوئی دنیا کا نظارہ کرا سکے۔ جس کو اب اس بستی بھر میں صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ کتنی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرا بچپن بڑا شریر ہے، بڑا ظالم۔ اس نے البم سے نکال کر ساری کی ساری تصویریں میرے اوپر ہوا میں اچھال دی ہیں اور میں دیوانوں کی طرح ایک ایک تصویر پر جھپٹ رہا ہوں جو میرے اطراف زمین پر ڈھیر ہو رہی ہیں۔ لیکن میں جھک کر دیکھتا ہوں تو زمین پر کوئی تصویر نہیں ہے۔ عمر رفتہ کا کوئی نقش پا نہیں ہے۔

مقفل دروازے پر، چلڈرن ویلفیر سنٹر کی تختی لگی ہے۔ میں اسی آنے والی نسل کو اپنا البم سونپ کر لوٹ رہا ہوں جس کی تصویریں نوچ لی گئی ہیں۔

باہر نکلتا ہوں تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ایک نوجوان بند کھڑکی کے سائبان کے نیچے کھڑا اپنا چہرہ کھڑکی کے پٹ پر جمائے روزن میں سے جھانک رہا ہے۔ میں اپنی برساتی کہیں بھول آیا ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں برساتی صدر ... کے شہ نشین پر دھری ہوئی مل جاتی ہے۔ میں سے اوڑھ کر باہر نکل آیا ہوں ـــ نوجوان بے خبر ہے۔ جب میں اس کے قریب نظریں جھکائے گزرتا

ں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کھڑکی کے اندر دبی پتوں پر بھی کسی کے جلتے ہوئے ہیں
ال رکھے ہوئے ہیں ___ تپتے ہوئے ہونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے دبے دبے
دموں کی چاپ سن کر نوجوان میری طرف دیکھتا ہے میں بھی باوجود اس کوشش کے کہ
ں کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ میں اس راز دنیاز کو تاڑ گیا ہوں۔ اس کی
طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی ناک اور گالوں پر کھڑکی کا ہرا رنگ نمایاں
طور پر لگ گیا ہے۔ یہ ان بوسوں کی حسرتیں ہیں، جو نہیں لئے جا سکے۔ نوجوان
س بات سے بے خبر ہے کہ اس کی یہ حسرتیں اس کے چہرے پر ابھر آئی ہیں۔
جیسے اس راہ گیر نے دیکھ لیا ہے جس سے اس کی آنکھیں ابھی ابھی چار ہوئی تھیں۔
ور واقعی میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

شامی میری منتظر ہو گی۔ چھوٹو میرے لیے ضد کر رہا ہو گا۔ حدّو اور ریٹیا اسے
بہلا رہے ہوں گے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا، مسافر بنگلے کی طرف لوٹ رہا ہوں۔
یں نے اپنے بچپن کو جو اسٹیشن سے بستی تک میرے ساتھ آیا تھا، یہیں چھوڑ دیا ہے۔
یں پھر اداس ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے سارے آنسو شامی کے دامن کی بھینٹ
چڑھا کر خاموش ہو جاؤں۔ پھر خیال آتا ہے کہ خود اس کے پاس ان آنسوؤں کی کمی
نہیں۔ میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے جو شامی کو دے سکوں ___ موم بتی کے آنسو
سے کھیلنے والی یہ لڑکی اپنے دامن میں آنسوؤں کی کتنی ہی دولت سمیٹے ہوئے ہے
جو موتی تو نہیں بن پاتے اس کی آنکھوں میں کنکر بن کر کھٹکتے ضرور رہے ہیں۔

اس غم کی اساس کیا ہے؟ کچھ بھی ہو، لیکن پھر کسی کی یاد میرے ذہن میں میرے
دل میں، میری روح میں اپنا زہر قطرہ قطرہ کر کے ٹپکا رہی ہے ایسا زہر جو اب

میری نس نس میں سرایت کر کے مجھے پیارا ہو گیا ہے۔ ہر وہ غم جو زندگی کے کسی رخ سے کبھی مجھ تک پہونچتا ہے۔ ہر پھر کر اسی ایک یاد سے وابستہ ہو جاتا ہے جسے میں نے بڑے جتن سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہ بھی ایک بارہ سالہ کھلنڈرے شریر لڑکے کی یاد ہے۔ یہ وہ لڑکا نہیں ہے جو اسٹیشن سے بستی تک میرے ساتھ تھا۔ اور جس کو میں ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی زندگی بھر کی تنہائی ہے۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی تکمیل کا نام ہے، جو نہ ہو سکی نہ ہو سکے گی... یہ لڑکا میرا بچہ ہے۔ میرا بیٹا۔ میری جان۔

اس لڑکے نے اپنا بارہ سالہ خوبصورت ماضی مجھے سونپ دیا ہے۔ اور اس ڈھنگ سے سونپا ہے کہ یہی بارہ سالہ ماضی اس کا حال بھی ہے، اس کا مستقبل بھی۔ اس نے سوا اُس کا نہ کوئی حال ہے، نہ کوئی مستقبل۔

مجھے یاد ہے، ایک بار اس نے اپنے پڑوس کی، ساتھ کھیلی ہوئی لڑکی سے کہا تھا۔

"منی، میں تجھے اپنی بہن نہیں بناؤں گا۔"

اس بہن نہ بنانے میں کیا کچھ نہ بنا لینے کا جذبہ تھا... میں بھانپ گیا تھا میں تاڑ گیا تھا۔ طوفان کی آمد آمد کو میں نے پہچان لیا تھا...

میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"کیا بنائے گا پھر؟"

اس نے مجھے جھکی جھکی شرمیلی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت جھکی جھکی نظریں آج تک نہیں دیکھی ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے خود اس کی بھی ایسی جھکی جھکی نظر پھر کبھی نہیں دیکھیں۔

وہ ایک دن کھیلتا کھیلتا مجھ سے، شامی سے، اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائیوں سے جدا ہو گیا۔ اس طرح جدا ہو گیا جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے لمحے بھر کے لیے چھپنا چاہتا ہو، پھر سامنے آنے کے لیے۔ لیکن وہ لمحہ ہی ٹھہر گیا جس لمحے وہ چھپا تھا۔

لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے ــ میں سوچتا ہوں، کاش ایسا ہی ہوتا، شاید وقت اس زخم کو مندمل نہیں کر سکتا، جو وقت کے ٹھہر جانے سے انسان کے دل پر لگتا ہے۔

میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے غور سے دیکھا۔

کیا تم وہی ہو جنھوں نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟

کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟

میں نے منہ پھیر لیا، تو اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیے۔ ٹھیک ہے، آج سے میں بھی اسی کو ڈھونڈوں گا جسکی تمھیں تلاش ہے۔ لیکن کیا اس تلاش میں ہم کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟

میں پلٹ کر دیکھے بغیر آگے نکل آیا ہوں۔

چھوٹو ڈھونڈ رہا ہوگا۔

نَدو۔ بٹیا۔

انھیں خوب چوموں گا۔ لیکن عین اس وقت کوئی اپنا گال بھی میرے ہونٹوں پر رکھ دے تو؟

میری اور شامی کی محبت کا پہلا حق دار تو آج بھی وہی ہے نا۔

میرے چہرے پر ان بوسوں کی حسرتوں کا کون سا رنگ ابھرے گا؟

بہادر

مصنوعی سلک کی سفید قمیص، بھر واں چوکڑی کی نئی تہمد شعلے کا طرہ نمایاں نمایاں، جبڑوں میں پان کا بیڑہ دبائے علی بہادر ضلع کی بستی سے گزرتا تو ہنس ہنس کر سلام کرتا بھی سلام لیتا بھی۔ پولیس ایکشن کے بعد اس نے حیدرآبادی کورنش بجالانا چھوڑ دیا تھا۔ بڑے ادب سے نمستے کرتا، دونوں ہاتھ جوڑ کر۔ علی بہادر کو سلام کا یہ نیا طریقہ اس لیے راس آیا کہ اس کی دستی گھڑی کی نمائش آسانی سے ہونے لگی علی بہادر آستینیں اٹھائے رکھے بھی تو سارا زمانہ کام دھندہ چھوڑ کر گھڑی کو تکنے سے رہا۔ "نمستے" میں یہ مشکل آسان ہوگئی تھی۔

جب سے ضلع کا نیا عہدے دار آیا تھا، علی بہادر پر سلاموں کی بارش ہونے لگی تھی۔ بستی کا چپراسی اور وہ بھی منہ چڑھا۔ دفتر میں علی بہادر کی چلتی، گھر میں علی بہادر کی۔ اور اب تو بستی بھر میں علی بہادر کی چلنے لگی تھی۔ عہدہ دار تو دیکھنا بھی آسمان

کی طرف تھا چلتا بھی آسمان ہی پر تھا۔ وہاں تو فرش بھی وہی تھا عرش بھی وہی۔ مگر علی بہادر تو اسی زمین کے بسنے والے تھے۔ چھوٹوں سے میل جول بڑوں سے میل ملاپ۔ جتنے آداب سلام، آسمان پر نظر رکھنے کی وجہ سے عہدہ دار تک نہ پہونچتے اور زمین ہی پر ادھر ادھر ڈھیر ہو جاتے، وہ سب کے سب علی بہادر سمیٹ لیتے۔

علی بہادر پہلے بھی چپراسی تھے۔ آج بھی چپراسی ہیں۔ لیکن آج جو اہمیت انھیں حاصل ہو گئی تھی وہ نئے عہدے دار ہی کی جوتیوں کا طفیل تھا۔ اسی احساس نے علی بہادر کو اس قدر وفادار بنا دیا کہ وہ جلوتوں سے اٹھ کر عہدے دار کی خلوتوں تک جا پہنچے اب تو وہ منھ چڑھے پیشی کے اردلی ہی نہ تھے، ہم راز بھی تھے۔ ہم سفر بھی۔

نظام باڑے سے بی جانی کو ساتھ لے کر کچی سڑک تک پہونچتے پہونچتے علی بہادر نے کتنے ہی سلام لیے، کتنے ہی نظر انداز کر دیے۔ وہ گزر گئے تو سلام کرنے والوں نے اشاروں کنایوں میں باتیں کیں۔ کچھ اور آگے بڑھ گئے تو سرگوشیوں تک نوبت پہونچی۔ بی جانی لاکھ برقعے میں ہوں۔ بدن کے لپکتے ہوئے شعلے اپنی نوکیلی زبانیں برقعے کے باہر بھی تو نکال کر راہ چلتوں کو ڈستے ہیں۔

بی جانی کو کچھ ایسے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کے بچپن کے خاموش سے ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر اس کی جوانی نے ایک پتھر دے مارا اور رشانی تڑپ تڑپ اٹھی۔ چھپارے، گھرپے اور بالیدے کی قابِ پیچ رنگ میں رنگے ہوئے لال کپڑے سے ڈھانک کر بی جانی کی نانی صرف دو ایک گھروں ہی میں دے آئی جن سے تعلقات بہت گہرے تھے ان میں سے ایک گھر تو ایسا بھی تھا جہاں بی جانی کی بات پکی ہو چکی تھی۔ نانی نے سوچا اب ایسوں سے بھی کیا چھپانا جو بھولی بھیلانے ٹھیک ا سی

شاخ کے نیچے بیٹھے ہیں کہ پھل پکتے ہی پٹ سے اسی جھولی میں گرے گا۔ ہاں پرائے البتہ پرائے تھے اور پھر اسی میں مصلحت بھی تھی کہ بی جانی آسانی سے گھوم پھر سکتی۔

نانی راز کے پردے بی جانی کی جوانی پر ڈال کر مطمئن ہو بیٹھی کہ جہاں وہ چاہے گی بس وہیں یہ راز افشا ہوگا۔ لیکن علی بہادر برقعے میں ڈھکی ہوئی بی جانی کو لے کر پکی سڑک تک ہی پہونچے تھے کہ لونڈوں نے ایک دوسرے کے کہنیاں ماریں۔ ٹھوکے دیئے۔

"منبر پر آگئی ہے خان"

"اب تو برقعے بغیر نکلتی ہی نہیں"

"کیا پٹاخہ تھی یار"

لیکن علی بہادر کس گھر کے کس پتھر پر اس پٹاخے کو دے ماریں گے ابھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

پولیس ایکشن نے خاص طور پر اس ضلع کے مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی کے نام پر اتنا اوپر اٹھایا تھا کہ وہ اس زمین سے اکھڑ کر سیدھے آسمانوں تک جا پہنچے تھے۔ کتنی مائیں اپنے گڑیل نوجوان بیٹوں کو کھو چکی تھیں۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کو۔ کتنوں کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ کتنوں کی محبت لٹ چکی تھی۔ اور ضلع کے کون سے گلی کوچوں میں اب یہ آئیں۔ بازار میں بکنے والا جسم بن کر رہ گئی ہیں۔ اس سے بھی بہادر واقف تھے۔

ایسا ماحول جو ضلع کی بستی کے ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہوتا، اس کی

حکم حاکم کو انھوں نے یہ درجہ دے رکھا تھا وہ تو کوئی صاحب ایمان جانے لیکن کہتے وہ ضرور کچھ اسی طرح تھے۔

"نہیں بھئی سویا رکھا چکی ہے۔ جس کسی نے سنچری کی وہ ہمارے ایمان سے خارج ہوئی۔"

انھیں کرکٹ کی سنچری والی بات بہت بھا گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس میں "سویا رکھا چکنے" کا عامیانہ پن نہ تھا۔ معنویت بھی تھی، اختصار بھی، نفاست بھی۔ اب وہ بہت آسانی سے کہہ دیتے۔

"نہیں بھئی سنچری کر چکی ہے۔"

علی بہادر نے ایک دن اپنے صاحب سے کہا بھی۔ انھیں ڈرتے ڈرتے سمجھایا بھی کہ سرکار جتنی اب تک آ چکی ہیں انھیں میں سے جو زیادہ پسند ہوں انھیں پھر لے آؤں۔

حاکم نے صرف اتنا ہی کہا "علی بہادر کیا ہم اپنی دھرم پتنی کو اسی لیے شہر میں چھوڑ آئے ہیں کہ یہاں آ کر کسی ایک عورت کے ہو رہیں۔ اگر یہی کرنا ہوتا تو ہماری دھرم پتنی بھی اتنی گئی گزری نہیں ہیں۔"

علی بہادر پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ بھیگا ہوا مرغ بنا حاکم کے سامنے کھڑا رہا۔

"اچھا حضور" اور انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے ادب سے نمستے کیا۔

وہ جانے لگے تو حاکم نے پوچھا "سمجھ گئے نا۔"

"ہاں صاحب۔"

علی بہادر باہر نکلے تو انھوں نے سوچا، اس تعداد میں تو بالکل نیا مال نہیں ملنے کا۔ صاحب کے منھ کو خون لگ گیا ہے۔ اس لگے ہوئے خون کو دھو ڈالنے کی ترکیبیں وہ سوچنے لگے۔

علی بہادر تو یہ چاہتے تھے کہ اتنی بہت سوں میں سے "صاحب" کسی ایک کا ہو کر رہے۔ ایک کا نہیں دو کا۔ دو کا نہیں چار کا، پانچ کا اس سے ان کا کام بھی ہلکا ہوتا تھا، ذمہ داریاں بھی کم ہوتی تھیں۔ صاحب کی زندگی بھی ایک ڈگر پر چل پڑتی اور وہ بھی چین اور اطمینان سے ان نعمتوں سے استفادہ کرتے جو صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے خوش حالی بن بن کر ان کے راستے میں بچھ رہی تھیں۔

ایک روز علی بہادر ایسے مقام پر جا نکلے جہاں کا آنا جانا انھوں نے عرصہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ انھیں مدتوں بعد ادھر کا رخ کرتے ہوئے ان کے چیلوں نے دیکھا تو بس دوڑ ہی تو پڑے۔

علی بہادر نے کہا۔

"لاؤ بھئی کوئی سیکنڈ ہینڈ ہی سہی"

علی بہادر کے ماتحت اور چیلے حیران تھے۔ لیکن علی بہادر نے یہی ترکیب سوچ نکالی تھی کہ خود "صاحب" کہہ اٹھیں گے کہ نئی چیزیں اس قابل نہیں ہیں تو وہی بہتر ہیں جن کی آزمائش ہو چکی ہے۔

لیکن صبح علی بہادر کی حیرت کی انتہا نہیں تھی جب کہ صاحب خوش تھا اور کئی راتیں اس نے "سیکنڈ ہینڈ" کے ساتھ گزار دیں۔

علی بہادر کے حوصلے بڑھ گئے۔ صاحب کو ادھ کھلی کلیاں پسند نہیں ہیں اس کو تو شگفتہ پھول چاہئیں۔

کچھ دن بعد صاحب نے اس قسم کے کسی دوسرے شگفتہ پھول کی پھر فرمائش کی۔

اب کی بار علی بہادر نے جب نئی عورت حاکم کے حوالے کی تو وہ رات بھر خود بھی نہ سو سکا۔

صبح ہوئی تو "صاحب" نے کہا۔

"بہادر تم واقعی بہادر ہو۔ کیا بپھری ہوئی شیرنی جنگل سے پکڑ لائے تھے کہ قابو ہی میں نہ آتی تھی۔ آنسوؤں کا تو خزانہ ہے اس کی آنکھوں میں۔ کہیں تم اسے دھوکا دے کر لائے ہو۔ بڑی مشکل سے قابو میں آئی وہ۔"

علی بہادر بس ہاتھ باندھ کر کھڑے مسکراتے رہے۔ یہ مسکراہٹ فی الوقت تو فاتحانہ بالکل نہ تھی، بڑی پرخوردارانہ تھی۔

جب حاکم نے کہا کہ۔

"علی بہادر! آج رات انھیں پھر لے آنا۔ ہاں!"

تو علی بہادر پگڑی کا طرہ بڑے بانکپن کے ساتھ درست کرتے ہوئے بہت ہی فاتحانہ انداز سے برقعہ پوش عورت کو ساتھ لیکر باہر نکلتے نکلتے رک گئے۔ پھر آہستہ سے قریب ہو کر کہا۔

"اب اس کو یہیں رکھ لیجئے۔ بڑی ضدی اور پانی کی عورت ہے۔ پتہ نہیں میری بات اب کبھی ماننے کی یہ۔ میں بھی نہیں رہوں گا تو آہستہ آہستہ مانوس ہو ہی جائے گی۔"

حاکم نے بڑی راز داری سے پوچھا۔

"پھر اس کے گھر والے؟"

علی بہادر نے صاحب سے اور زیادہ قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ اس نے بتایا نہیں آپ کو؟۔ یہ میری بیوی کا ہے"

"صاحب" نے علی بہادر کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

"تم بڑے بہادر ہو، بڑے وفادار"

علی بہادر پگڑی کا طرّہ بڑے بانکپن کے ساتھ درست کرتے ہوئے باہر نکل گئے تو حاکم کے منتظر کتنے ہی لوگوں نے انھیں جھک کر سلام کیا۔

ایک سوال

کپڑے بدل کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو کالونی کی نکڑ پر مجھے زینو مل گئی۔ دو وقت سے رہ رہا ہوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے جس کی میں تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ احساس چونکہ غیر شعوری طور پر میرے ذہن و دل میں رچ بس گیا ہے۔ اس لیے میں ان وقتی اداسیوں سے کچھ مانوس سا ہو چلا ہوں جن کی شاید کوئی اساس نہیں ہے اور جو دھیرے دھیرے میرا مزاج بنتی گئی ہیں۔ اسی عالم میں زینو مجھے کالونی کی نکڑ پر مل گئی ــــ پہلے تو میں نے اس کے سلام کا جواب سلام سے دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ چاہتا تو اس سے میں یہ پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر ــــ پیپل کے گھنے سایوں کے نیچے۔ بھری شام کے وقت، جہاں بہتی ہوئی تاریکیوں کو سڑک پر مدھم روشنی، اجالنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا انتظار ہے۔

زینو نئی نویلی دلھن ہے۔ اس کا شوہر کسی ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ جو رات گئے لوٹتا ہے۔ اور رحیم میرا دوست ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے لیے تمام ہی سے زینو کے منتظر رہنے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ زینو کی انتظار کی گھڑیاں تو دن ڈھلا سوتی، میں اور رات گئے بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا ــــ میں چپ چاپ اس کے پاس سے یوں گزر گیا۔ جیسے شادی کی بارات کے برابر سے جنازے کا کوئی جلوس گزر رہا تا ہے۔

اس نے خود مجھے پکارا مسکین بھائی ــــ میں نے یہ آواز کچھ اس طرح سنی جیسے کوئی پکار نہیں رہا۔ بلکہ پکارنے کی تمنا کر رہا ہے۔

میں اس کے قریب پہونچا تو اس نے کہا ــــ سجاد ابھی تک نہیں لوٹا ــــ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کا بند توڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے تردد ضرور ہوا۔ لیکن میں نے اسی لیے اپنی پریشانی اس سے چھپالی۔ اور جھوٹ موٹ ہی اس کا مذاق اڑاتا ہوا ہنسنے لگا۔

"تو بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟"

"تو پھر کیا کروں؟"

"خوب تم لڑکیوں کا جواب نہیں۔ گویا رونا دھونا بھی کچھ کرنے میں داخل ہے"

وہ مسکرانے لگی ــــ اس کے مسکرانے کا سماں بالکل ایسا تھا جیسے پیپل کے گھنے سائے میں، سڑک کی مدھم روشنی کا سماں۔

"بولیے نا ــ کیا کروں میں؟" اس کے رندھے ہوئے گلے کا نمایاں درد، اب سوزِ پنہاں بن رہا تھا۔

"دوسری بہنیں کہاں چلی گئیں؟" ــــ میں نے تفصیلات جاننے کے لیے پوچھا۔

"سب کی سب اڑوس پڑوس میں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں"

"اور تم یہاں کھڑی ہوئی آنسو زمین میں بو رہی ہو کہ فصل اگے تو کاٹ سکو"

"اللہ میاں بھائی ــــ کچھ کیجیے نا"

وہ اسکول گیا تھا آج؟ ــــ میں نے اس طرح جرح کی جیسے لمحہ بھر میں اسے لا کھڑا کر دوں گا۔

"جی ہاں گیا تھا۔ لیکن اب تک نہیں لوٹا" ــــ وہ پھر رو پڑنے کو تھی۔

اس کے لیے یہ چھوٹا سا حادثہ یقیناً تشویشناک تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ میں نے اس کے دکھ کو پوری شدت سے محسوس بھی کیا تھا۔ سجاد سے اس کا اکلوتا، چھوٹا اور چہیتا بھائی تھا۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھا۔ جہاں ایک بھول، ایک غلط قدم زندگی بھر کا حاصل ہو کر مستقل کا مقدر بن جاتا ہے۔ سجاد سے ویسے مجھے بھی پیارا تھا ــــ میرے اس تعلق خاطر کے دو سبب تھے ــــ ایک تو یہی کہ یہ بارہ تیرہ سالہ سا نولا، سلونا لڑکا نظرتاً بڑا نیک تھا۔ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے ابھی نہیں گزر رہے تھے۔ جو اس عمر کے لڑکوں کو اسکول سے اٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے ہیں۔ پھر بڑی بڑی سڑکیں اور شاہراہیں اس کی ہمدم و ہمراز بن جاتی ہیں۔ اور گھر میں ان کا جی نہیں لگتا۔ دوسری ایک جذباتی وابستگی جس بنا پر وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ تھی کہ میرے اپنے بچے کا وہ کبھی بڑا گہرا دوست بھی تھا۔ آج میرا بچہ بھی اس دنیا میں ہوتا تو یہ دوستی آج تک قائم رہتی۔ شاید وہ بھی ترنم کے دکھ درد کا کچھ مداوا کر سکتا اور اپنے دوست کی تلاش میں اپنے ننھے ننھے سے دھڑکتے ہوئے دل کو لیے لیے سرگرداں رہتا لیکن اس کا دل تو بس کھیلتے کھیلتے ہی ٹھہر گیا تھا اور وہ مجھ سے، اپنی ممی سے، اپنی بہن اور بھائیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو گیا تھا ــــ اور اس کے بعد میں آج تک اسے نہیں پکار سکا ہوں کہ منیر شام ہو گئی ہے گھر لوٹ آؤ۔

آج زینو نے سجادے کے گھر نہ لوٹنے کی بات اس ڈھنگ سے کی کہ میں تڑپ اٹھا۔ جی چاہا، اس سے پوچھوں کہ پگلی آنسوؤں کی فصل میں اگی ہے جو اگے گی ۔۔۔ سجادے تو صبح کا بھولا ہے جو شام کو گھر لوٹے گا ہی ۔۔۔ میرا منیرو تو شام کو اس طرح گھر سے چلا گیا کہ پھر نہ اس کی صبح ہوئی نہ میری ۔۔۔ زندگی اس کا منھ تکتی رہ گئی اور موت میرا ۔۔۔ سنتا ہوں کہ وقت نہیں ٹھہرتا ہے۔ لیکن میں نے منیرو کی جدائی کی وہ ایک شام یا تو پکڑ کر اپنے سینے میں چھپالی ہے یا پھر وقت ٹھہر گیا ہے۔ لیکن میں نے زینو سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بھلا پھر وہ بات جو دل کے زخموں کو کرید کر رکھ دیتی ہے کسی سے کیسے کہی جا سکتی ہے اور پھر آدمی کا دل دکھا ہوا ہو تو وہ دوسروں کے غم بھی اپنا لیتا ہے ۔۔۔ لیکن میں تو اپنے دکھ درد کا موازنہ اس کے غم سے کرنے چلا تھا ۔۔۔ یہ کیسی خود غرضی ہے۔ کتنا چھوٹا پن ہے ۔۔۔ اس کے باوجود میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی زندگی میں ایک بار ۔۔۔ صرف ایک بار پکار سکوں کہ "منیرو شام ہوگئی ہے تم بھی گھر لوٹ آؤ"

میں نے زینو کو تسلی دی۔ تم گھر چلی جاؤ ۔۔۔ سجادے آجائے گا وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

سجادے رات گئے گھر لوٹ آیا۔ زینو کا گھر میرے گھر کے برابر ہی تھا۔ مجھے رات ہی اس کے لوٹنے کی اطلاع مل گئی ۔۔۔ جی چاہا سجادے سے دل کھول کر باتیں کروں ۔۔۔ اس سے پوچھوں کہ اس کے چھوٹے سے دل پر اس نئے تجربے سے کیا گزری ۔۔۔ وہ گیا کیوں تھا اور آ کیوں گیا ۔۔۔ وہ کیا بات تھی جس نے اس کے دل سے اس کی بہنوں کی محبت چھین لی تھی۔ خون کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دل کے رشتے ضرور اٹوٹ ہوتے ہیں۔

صبح کو میں اس کے گھر گیا تو چاروں بہنوں میں گھرا ہوا وہ مطمئن سا بیٹھا تھا۔ سب کی سب

اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ زینو کی باتوں سے برہمی نمایاں تھی ـــــ زینو کا شوہر بھی بیچ بیچ میں سجادے کو دھمکا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اگر سجادے اسکول سے سیدھے گھر نہیں آئیگا تو پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دی جائے گی ـــــ سجادے کی دو بہنیں پھر آب دیدہ سی تھیں ـــــ پھر مجھے دیکھ کر جیسے ان کے آنسوؤں کو بہہ لینے کا سہارا مل گیا ـــــ اپنے مرحوم ماں باپ کو یاد کر کے وہ رو پڑیں ـــــ زینو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اچھا ہی ہوا جو ابا، امی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ سجادے کے یہ سب کرتوت دیکھتے تو اپنی موت نہ مر جاتے بھلا؟"

میں نے آپے کہا نا ـــــ کہ سجادے تو بہت پیارا سا لڑکا ہے اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے ابھی نہیں گزرے ہیں جو اسے اسکول سے اٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے لیکن وہ اپنی بہنوں کی اس اداسی سے، ان کی برہمی سے، غرض کہ ان کے ہر ردِ عمل سے اس طرح بے نیاز تھا۔ جیسے اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جو اس کی اپنی دانست میں اس کا سر جھکا سکتی تھی ـــــ مجھے سجادے کی یہ بے نیازی ہی تو کھل گئی۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے گزر گئے ہیں۔ جو اسے اسکول سے اٹھا کر کوچوں میں لے جا رہے ہیں اور اب سجادے زینو کے بس کا روگ نہیں رہا ہے۔

زینو اپنی چھوٹی بہنوں اور سجادے کی صرف بہن ہی نہیں تھی ـــــ وہ تو ان کی ماں بھی تھی۔ اور باپ بھی ـــــ اس نے خود پڑھا، اپنی تعلیم ہی کے دوران میں ٹیوشن کر کے اتنا کمایا کہ سب بہنوں کی کفیل ہوئی ـــــ سجادے تو اس کا راجہ بھیا تھا۔ راجہ بھیا کو تو اس نے بڑھ چڑھ کر ہی چاہا۔ راجہ بھیا کے تو بس اللے تللے تھے ـــــ لیکن یہ ساری محبتیں، چادر کی گنجائش میں سمٹی ہوئی تھیں ـــــ محبت کی وسعتیں لامحدود سہی۔ محبت کی دنیا کا اور چھور نہیں ہے

لیکن محبت کے امکانات بڑے سکڑے سمٹے ہوئے ہیں محبت کا کومل پودا تو دل کے ٹوٹنے سے لے کر روٹی کے نہ ملنے تک یکساں طور پر مرجھا جاتا ہے ـــــ زینو کی چادریں محبت کی وسعتیں سمٹ آئی تھیں۔ لیکن زمانے نے جوار اور گیہوں کے خوشے چادر کے دامن سے چرا لیے تھے۔

میں بھانپ گیا تھا کہ زینو کی یہی تہی دامنی پیار کے نرم و نازک پودے کو غیر محسوس طور پر کملانے کا باعث بن رہی تھی۔ نہ سجادے کا اس میں کوئی دوش تھا۔ نہ زینو کا۔ دونوں مجبور تھے۔ دونوں نردوش۔

میں نے جس طوفان کی آمد آمد سے آہٹ پالی تھی، اب وہ طوفان تو میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں سن چکا تھا کہ زینو کے شوہر نے اسکول کی نوکری سے بھی زینو کو منع کر دیا تھا۔ اور اس نے یہ نوکری چھوڑ بھی دی تھی ـــــ زینو کا شوہر چاہتا تھا کہ زینو جب اس کے گھر کی بہار بن کر آئی ہے تو یہ بہار اس کے اپنے گھر ہی کو چمن در چمن کر دے۔ زینو کے شوہر کا یہ مطالبہ بھی جائز تھا اور زینو نے اپنے گھر کو جنت بنا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ـــــ اب جب کہ ایک چاہنے والے شوہر کی بیوی بن گئی تھی۔ اب جب کہ وہ ایک گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ اب جب کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ تو سجادے اس کا چہیتا ہونے کے باوجود بھی نہ اس کا حاصل زندگی تھا ـــــ نہ مرکز نگاہ ـــــ اب تو زینو محبت ہی محبت بن کر سب میں تقسیم ہوتی بکھر رہی تھی۔

ایک دل تھا، سو اس میں، اس کا شوہر، اس کا گھر، اس کا ہونے والا بچہ، اس کی بہنیں، اس کا سجادے، سب کے سب اس طرح بے صبری سے داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے تنگ گلی میں کسی بپھرے ہوئے جلوس کے بلوائی داخل ہوتے ہوں ـــــ اور زینو ہر ایک کے آگے اپنا دل کھول کھول کر رکھ رہی تھی ـــــ اس نے اپنے دل کا دروازہ بھی کھول دیا

تھا، دریچے تھی ۔۔۔ جو دروازے سے آ سکتا تھا، آ رہا تھا ۔۔۔ جس کے بس میں نہ تھا۔
وہ دریچوں سے ہی پھلانگ رہا تھا۔ لیکن زینو کے شوہر نے جب یہ افراتفری دیکھی تو سارے
دریچے بند کر دیئے اور دروازے پر پہرے دار کی طرح بیٹھ گیا۔

اس پہرہ بیداری کا شدید ردِ عمل سب سے پہلے سجاد ہی پر ہوتا تھا۔ سو ہوا بھی۔
وہ اپنے اندر ہی اندر کچھ گھٹا گھٹا سا محسوس کرنے لگا کہ لارڈ صاحب سودا سلف لے آئے۔
وہ پہلے [illegible] سوچنے لگا کہ آج گھر کا ایک اہم کام اس نے ادھورا چھوڑ دیا۔
غرضیکہ گھر کی فضا میں کچھ ایسی پرچھائیاں سی چلنے پھرنے لگیں جنہیں پہلے کبھی
سجاد نے نہیں دیکھا تھا۔

سجاد یہ کام کرو ۔۔۔ سجاد وہ کام کر دو ۔۔۔ اسکول میں پڑھتے ہو تو کوئی
احسان نہیں کرتے ہو سجاد۔ اپنی عمر کو دیکھو ۔۔۔ اس عمر میں تو آدمی اپنا بار خود اٹھا لیتا ہے۔
سجاد نے کالونی بھر کے لڑکوں میں کسی کو نہیں دیکھا جس نے اس عمر میں اپنا بار آپ
اٹھایا ہو۔ سب کے سب اسکول سے لوٹتے تو اطمینان سے غروبِ آفتاب تک کھیلتے رہتے۔ سجاد
ترس ترس کر رہ جاتا۔ صبح اسکول جانے سے پہلے وہ منہ اندھیرے گھر کا کام کاج کر دیتا۔ لیکن
شام کو اس کا جی نہ گھر کے کام ہی میں لگتا نہ کھیلنے میں۔ اس کا چھوٹا سا دل اپنے گھر میں رینگتی
ہوئی ان پرچھائیوں سے خوف سا محسوس کرتا تھا جو اس کی امی سے چھپتی زینو باجی کو بھی چھینے
اجنبی سا بنا رہی تھیں ۔۔۔ دل کی دنیا پر اداسیاں چھا رہی ہوں تو دکھاوے کی جگنو کی
ترنگ اور بے معانی تمنا خود اپنے آپ ہی کھلنے لگتے ہیں۔ خواہ انھیں کوئی بھی پاتے کہ [illegible]
۔۔۔ سجاد بھی اپنے ہمجولیوں کے جھرمٹ میں کھیلتا کھیلتا اداس ہو جاتا۔
ایک دن اس کے دل نے اس سے کہا ۔۔۔ سجاد اپنا بار آپ اٹھا لو۔

اس نے دل کی بات مان لینے میں پس و پیش سے کام لیا ـــــ دل نے پھر کہا۔
سجادے اپنا بار آپ اٹھا لو۔
اور جب سجادے نے اپنا بار آپ اٹھا لیا تو کالونی کی نکڑ پر مجھے زینو مل گئی ـــــ
چاہتا تو میں زینو سے پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر ـــــ پیپل کے گھنے سایوں کے نیچے، بھری شام کے وقت جہاں بہتی ہوئی تاریکیوں کو سڑک کی مدھم روشنی، اجالنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا انتظار ہے۔
لیکن میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی ـــــ سجادے لوٹ آیا تو زینو نے مجھے خود بتایا کہ سجادے نے کسی ایرانی کے بڑے سے ہوٹل میں ملازمت کر لی ہے۔ اور اب وہ اسکول سے سیدھا اسی ہوٹل کو جایا کرے گا۔ جہاں رات گئے ایک دو بجے تک اسے کام کرنا ہے۔
زینو مجھ سے کہنے لگی ـــــ اب آپ ہی سمجھائیے نا مینن بھائی سجادے کو ـــــ وہ تو کہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دینے کے لیے میں جبر کروں گی تو وہ گھر ہی سے کہیں چلا جائے گا۔
اور زینو کی آنکھیں زمین میں آنسو بونے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔
میں نے سجادے کو نظر بھر کر دیکھا ـــــ اس کے چہرے پر ارادے اور عزم کی سرخیاں تھیں۔ شفق کی ایسی سرخیاں جو نمودِ سحر کا پتہ دیتی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ سجادے نے اندھیرے کی طرف نہیں اجالے کی جانب قدم اٹھایا ہے۔ اور ایسے میں اسے نہ میں روک سکتا ہوں نہ زینو ـــــ اور ہوا بھی یہی ـــــ میں اور زینو ہار گئے تھے۔ سجادے کی جیت ہوئی تھی ـــــ اور اس نے وہی ملازمت جاری رکھی۔
لیکن اپنی منزل کی جانب بڑھنے والا یہ تنہا اور اکیلا راہی سجادے بھی ایک شام کالونی

کے اسی ہوٹل پر اداس اور ملول کھڑا مجھے نظر آیا۔ جہاں کبھی زینو اسی عالم میں کھڑی ملی تھی۔

میں اس کے پاس گیا ـــــ اس سے بہت قریب ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے سجادے؟"

سجادے کی چپ نے مجھے اصرار کرنے پر مائل کیا ـــــ میں نے یہ اصرار اس سے پوچھا ـــــ کچھ بتاؤ بھی سجادے شاید میں کچھ کر سکوں۔

سجادے نے بتایا کہ آج ہوٹل کے کام سے چھٹی کا دن ہے لیکن کالونی کے لڑکے جن کا وہ کبھی بہت پیارا دوست تھا آج اس کے ساتھ کھیلنے سے گریز کر رہے ہیں۔

اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

دیکھیے وہ سب کے سب مجھے ہوٹل کا چھوکرا پکار رہے ہیں میں نے تو اپنا بار آپ اٹھایا تھا۔ میں نے کوئی برائی تو نہیں کی تھی ـــــ لیکن وہ مجھ سے کھیلنا تک گوارا نہیں کرتے ـــــ ان کے بڑوں نے انھیں منع کر دیا ہے ـــــ بتائیے نا اب میں کیا کروں ـــــ میں کہاں جاؤں ـــــ کس سے کھیلوں ـــــ

میرے بدن میں جیسے لہو کی ایک بوند بھی اس وقت نہیں تھی۔

میرا ذہن جس پر ابھی ابھی بجلی گری ہے۔ یہ سوچ رہا ہے کہ میں سجادے کو کوئی جواب دوں۔ لیکن کوئی جواب مجھے سجھائی نہیں دے رہا ہے۔

آپ ہی بتائیے میں سجادے کو کیا جواب دوں؟ ـــــ وہ منتظر ہے۔

میں اس کا غم کس طرح بانٹ لوں۔

قلبِ شہر میں واقع اس عمارت کا ماضی بھی بڑا شاندار رہا ہے اور حال بھی۔

پھاٹک میں داخل ہوتے ہی بڑا احاطہ ہے جس کے بیچوں بیچ بیضوی وضع کا بہت بڑا حوض ہے
حوض کے درمیان ایک فوارہ ہے اور اپنے شفاف پانی اور رنگ برنگی مچھلیوں کے لیے
مشہور ہو گیا ہے۔ حوض کے اطراف نرم و نازک تر و تازہ ہریالی پر کم سے کم سو
کرسیاں بچھائی جا سکتی ہیں۔

اس کے بعد سیڑھیاں ہیں جو آپ کو عمارت کے دامن میں لے جاتی ہیں۔ دامنِ عمارت
کا یہ حصہ اور بھی زیادہ دل لبھانے والا، اور بھی زیادہ پُرکشش ہے۔ ہمالہ کی ترائی کی طرح
دامنِ کوہ میں جو رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں وہ ساری رنگینیاں کچھ زیادہ ہی اہتمام سے
اس بلند عمارت کے اطراف سمیٹی گئی ہیں جو سطحِ زمین سے بلندی پر واقع ہے۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سیدھی جانب تراشی ہوئی باڑھ کے مجسمے بنے ہوئے ہیں

جو تعداد میں پانچ ہیں۔ ان کے مقابل رنگا رنگ پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ہیں۔
کیاریوں کے اطراف سیمنٹ کے بنے ہوئے گملے ہیں اور پھر اسی ہریالی کا سلسلہ ہے جس کے درمیان میں
سرو کے درخت ہیں۔ اس ہریالی کے دو حصوں کو بانس کے جال سے گھیر لیا گیا ہے اور یہ جال
اس حد تک حسین ہیں کہ بانس کا ایسا دلکش طریقہ استعمال میں نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک ہی
گولائی کے تراشے ہوئے بانس ہر چھ انچ کے فاصلے پر زمین میں پیوست کر دیے گئے ہیں
اور ان پر دمکتا ہوا رنگ اور جھلکتا ہوا سفیدہ اس طرح پھیرا گیا ہے کہ ایک بانس ہرا ہے تو
ایک بانس سفید اور سفید و سبز کا یہی سلسلہ ہریالی کی پشت پر پھیلا ہوا ہے۔

سیڑھیوں کے بائیں جانب چبوترے کے وسیع حصے سفید محدب ——— چینی
کا فرش ہے اور دوسرے نصف حصے پر بالکل سرخ چینی کا۔ آپ ایک نظر میں ان دونوں
وسیع حصوں پر بکھری ہوئی بینت کی سفید اور سرخ کرسیاں اور میزیں دیکھ سکتے ہیں۔
جو نظروں کو بے اندازہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سفید چینی کے وسیع حصے پر سرخ میزیں اور
کرسیاں اور سرخ چینی کے نصف حصے پر سفید میزیں اور کرسیاں۔ ان دونوں سفید
اور سرخ حصوں پر گوشۂ ابلق اور گوشۂ احمر کی سنگ مرمر کی تختیاں لوہے کے خوبصورت
سے 'اسٹینڈ' پر ٹنگی ہوئی ہیں جو بالترتیب سفید اور سرخ ہیں۔ لیکن اب انھیں ان ناموں سے
کوئی نہیں پکارتا بلکہ یہ 'وہائٹ کارنر' اور 'ریڈ کارنر' کے نام سے مشہور ہے۔

'وہائٹ کارنر' اور 'ریڈ کارنر' کے دلدادگان ——— شام ہوتے ہی
اپنے اپنے 'کارنر' سنبھال لیتے ہیں لیکن جنھیں ہریالی پسند ہے ان میں بھی تفریق اس طرح ہے کہ
وہ لوگ جنھیں ہریالی اور سرو کے لمبے لمبے درخت پسند ہیں وہ سیڑھیاں چڑھ کر بلندی پر بچھی
ہوئی ہریالی پر آ بیٹھتے ہیں اور وہ لوگ جنھیں ہریالی پر فواروں کی رم جھم اور ہلکورے لیتے

ہوئے پانی میں تھرکتی ہوئی مچھلیاں، پسند ہیں وہ نچلی ہریالی ہی پر بیٹھے رہتے ہیں۔

اس کے بعد شیشے لگے ہوئے بڑے بڑے 'اسپرنگ' کے دروازوں کو کھول کر آپ کو عمارت میں داخل ہونا پڑتا ہے آپ کے عمارت میں داخل ہونے کے بعد 'اسپرنگ' لگا شیشے کا دروازہ جیسے مسرت میں جھومتا رہتا ہے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی آپ کا پہلا قدم ایران کے اس قالین پر پڑتا ہے جس پر پاؤں رکھتے ہی آپ کے آدھے جوتے قالین میں چھپ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رنگا رنگ تازہ و فرحت بخش پھول فرش پر تہہ در تہہ بکھیر دیے گئے ہیں اور آپ انھیں روند کر گزر رہے ہیں شبہہ ہوتا ہے کہ روندے ہوئے ان پھولوں میں یہ شگفتگی اور تازگی کس طرح ہے۔

یہ ایک بہت بڑا وسیع ہال ہے جس میں آپ کم کم روشنیوں اور مدھم مدھم روشنیوں کی مدد سے داخل ہوتے ہیں۔ بڑی رومانی فضا یہاں پیدا کی گئی ہے۔ روشنیوں کے اہتمام میں حالیہ 'ٹیکنک' کو استعمال کیا گیا ہے کہ چھت کو حسین نقش و نگار سے مزین کر کے روشنیاں 'ٹیوب' لائٹ کی مدد سے پھیلا دی گئی ہے، لیکن اس طرح کے چھت میں چھپی ہوئی 'ٹیوب' لائٹیں تمہیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں۔ صرف روشنیاں بکھر جاتی ہیں وہ بھی کم کم، مدھم مدھم۔

چھت کے بیچوں بیچ جو حصہ ہے اس کے اطراف ستونوں میں گوٹے چھپا دیے گئے ہیں۔ جو سلگتے ہیں تو چھت پر ٹکے ہوئے ستاروں، آسمانی ستاروں کی طرح جھلملاتے لگتے ہیں۔ ایسے میں ہال کے اندر پھیلی ہوئی دوسری روشنیاں یا تو گل کر دی جاتی ہیں یا کم کر دی جاتی ہیں تاکہ درمیانی حصے کا یہ حسن اور نکھر سکے اور ابھر سکے۔

قالین پر بکھرے ہوئے صوفے بڑے نرم اور بڑے دیدہ زیب ہیں جو دیواروں کی جانب پشت کر کے رکھے گئے ہیں اور جن کی سادگی ہی ان کا حسن ہے۔ ان کے آگے میزیں پڑی ہیں

ان کے آگے میزیں پڑی ہیں اور ان کے مقابل گدّے کی نرم کرسیاں جن کی وضع دائرہ نما ہے۔
شہر کے اس سب سے خوبصورت اور شاندار ریسٹوراں "دربار" سے آفتاب احمد ایم۔ اے کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس عظیم عمارت کی بنیادیں زمین میں جتنی گہری ہیں، اتنی ہی آفتاب احمد کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہیں۔ رکاسی، آفتاب احمد کی زندگی میں تیس سال قبل اپنی خواب گوں فضاؤں سمیت کچھ اس طرح داخل ہو گئی تھی جیسے کوئی انجان دوشیزہ آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت آفتاب احمد بیس سال کا دبلا پتلا اور چھریرا سا صحت مند نوجوان تھا۔ کالج کی زندگی تھی، بے فکری کے دن تھے۔ اس کی زندگی دنیا کے وسیع کارخانے سے ابھی اس طرح وابستہ نہیں ہوئی تھی کہ اس کے تصوروں کی دنیا تحس نحس ہو جاتی۔ اچھی بری کتابیں پڑھنا، بحث کرنا، دوستوں کی محفلوں میں خوش ہونا اور انھیں خوش کرنا بس یہی باتیں حاصل زندگی تھیں۔

کالج کے ساتھیوں میں مخدوم سے آفتاب کی بہت گہری چھنتی تھی۔ ان کے ایک دوست نے کسی امتحان میں کامیابی حاصل کی تو مخدوم اور آفتاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ رکاسی میں دعوت ہونی چاہیے۔ رکاسی میں دعوت طے ہوئی۔ تینوں مل کر دھڑکتے دل سے رکاسی پہونچے۔ جذبۂ شوق کی فراوانی ۔۔۔۔۔۔ اور تازہ تجربوں کے اشتیاق نے رگوں میں خون کی روانی کو خود ہی تیز کر دیا تھا۔ اس پر کنجی چھاپ بیر کا آرڈر دیا گیا۔ ان دنوں دیکھیں، بیر کی قیمت دس، بارہ آنے فی بوتل تھی۔ بیرا تین بوتل بیرے آیا تو دیکھتے ہی ان تینوں دوستوں کے ہوش بجا نہ رہے۔

تینوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا، نظروں نظروں میں باتیں ہوئیں اور دو بوتل واپس کرنے کا حکم فوری دے دیا گیا۔ بیرا مسکرانے لگا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ اس کو جیب میں پہلی بار

ان نوجوانوں نے قدم رکھا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ایک بوتل بیر تینوں پر اتنا اثر کرے گی کہ جھومتے جھومتے بدمست لوٹیں گے۔

بیرا کو مسکراتا ہوا دیکھ کر تینوں مسکرانے لگے جیسے اس کی مسکراہٹ میں ان کی اپنی مسکراہٹ بھی چھپی ہوئی تھی۔ جب بیر تینوں گلاسوں میں تقسیم کر کے بیرا چلا گیا تو ان لوگوں نے اپنے جام اٹھا کر ٹکرائے اور ادھر ادھر دیکھ کر ہر ایک نے چسکی لی۔

"یار یہ تو کچھ عجیب کڑوی کسیلی سی ہے" آفتاب احمد نے کہا۔ دوسروں نے منھ بنا کر گویا اس بات کی تصدیق اور تائید کی لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ مزہ تو اب ان لوگوں نے چکھ لیا تھا جو بڑا ناپسندیدہ ثابت ہوا۔ اب بیر دے کر اس کا اثر دیکھنا تھا۔ جیسوں تیوں کر کے اپنے گلاس خالی کیے لیکن انھیں ذہنی کیفیت میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ اس نئے تجربے کو اتنا بے اثر اور فضول مان لینے کے لیے ان کا جی نہ چاہتا تھا۔ پی ہی تھی تو ان کا تقاضا تھا کہ کچھ محسوس بھی کریں لوگ تو کیسی کیسی باتیں کرتے تھے۔ تینوں نے مشورہ کیا کہ اب سیدھے سیدھے کھانے کے کچھ اچھی چیزیں منگوانی چاہییں اور رہیں۔

میزبان دوست نے بیرا کو پکارا تو محرم نے کہا، "آواز میں بڑا لوچ آگیا ہے، شاید یہ اسی کا اثر ہے۔" آفتاب احمد نے کہا کہ "چراغ زیادہ روشن معلوم ہو رہے ہیں اور شاید زیادہ گہرے۔" پھر تینوں مل کر ہنستے رہے۔ معلوم تو کیا خاک ہو رہا تھا، بس تینوں کی یہ خواہش تھی کہ ایسی کوئی بات ہوتی جو انھوں نے سنی تھی۔

پرتکلف کھانا کھانے کے بعد جب ان تینوں دوستوں نے رکاسی کو چھوڑا تو آفتاب احمد دل ہی دل میں رکاسی کا ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رکاسی نہیں تھی جس کی مشہور رکن رقصا کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ تیس سال پہلے کے رکاسی میں بعضوی بڑا حوصلہ تو تھا لیکن وہ خشک

پڑا رہتا تھا اور اس کے اطراف ہریالی کی بجائے کانٹے دار لوہے کے تار لگے جو اس کو محصور کیے ہوئے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر بلندی پر پہنچنے کے بعد سیدھی جانب سبز باڑھ کے جھرمٹ تھے جس کی باڑھ کو یہاں تراشا تک نہیں جاتا تھا۔ سرو کے سایوں والی ہریالی کی بجائے بس ایک چھوٹا سا کھلی ہوئی زمین تھی اور بائیں جانب بھی نہ گوشۂ ایلٹ تھا نہ گوشۂ احمر جو بعد میں "وائٹ کارنر" اور "ریڈ کارنر" کے نام سے مشہور رہا بلکہ ایک مسطح بڑا سا چبوترا جس کے اطراف ہری باڑھ لگی ہوئی تھی اور جس پر کرسیاں بچھی رہتیں۔ تین سال پہلے رکاسی کی عمارت میں داخل ہونے پر نہ آپ کے پیچھے "اسپرنگ" کے دروازے سرزنش سے جھولتے، نہ کہ چھپکلیوں کو روندنے کا احساس کسی قالین پر پیر رکھتے سے ہوتا تھا، نہ بڑے ہال کی وہ کم کم اور مدھم مدھم روشنیاں تھیں، نہ چھت کے وہ نقش و نگار تھے، نہ رنگوں کے امتزاج سے یہ سماں بنتا تھا، نہ ستارے آسمان سے اتر کر چھت پر آتے تھے۔ بس ایک سیدھا سادا بہت بڑا ہال تھا جس میں لکڑی کے لاٹوں سے علاحدہ علاحدہ عارضی کمرے بنا دیے گئے تھے جن میں روغن چڑھی ہوئی بینت کی کرسیاں اور میزیں پڑی تھیں۔ ہال کا ایک پورا نصف حصہ جو بڑے بڑے ستونوں کے اس طرف تھا رکاسی کے منتظمین کے قبضے و تصرف میں تھا۔

ہال کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ اس کے بیچوں بیچ جو بڑے بڑے ستون تھے، ان سے ملحق الماریاں رکھ دی گئی تھیں، جن میں مختلف قسموں کی شرابوں کی بوتلیں، گوشت مچھلی بنانے اور جام کے ٹن، پنیر اور مکھن، چائے اور کافی کے پیکٹ اور مختلف کھانے کی چیزیں دھری رہتیں۔ یہ الماریاں ستونوں کی مدد سے گویا ہال کو دو حصوں میں تقسیم کرتیں۔ اس طرح پچھلا حصہ رکاسی کے منتظمین کے لیے مختص ہوتا اور یہی رکاسی کے تقریباً تیس سال تک کم و بیش اسی حالت میں آفتاب احمد کا رفیق رہا ہے۔

لیکن آج رکاسی کا یہی ہال اپنی حیثیت بدل کر کیا سے کیا معلوم ہونے لگا ہے۔ نہ وہ لکڑی کی اوٹ ہیں، نہ وہ روغن چڑھی کرسیاں، نہ وہ بڑی بڑی الماریاں جو منتظمین کو گاہکوں سے علاحدہ کرتی تھیں اور جو راستہ گئے پرانے اور خاص خاص گاہکوں کے لیے جائے پناہ بنتی تھیں۔ اس طرح کہ بار کا وقت ختم ہو جائے پھر بھی منتظمین کسی کو جس پر وہ مہربان رہتے، ان الماریوں کے پیچھے چھپا کر شراب دیتے تھے۔

آفتاب احمد کی کتنی ہی یادیں اس حال سے وابستہ تھیں، جس نے آج چولا بدل لیا ہے اس کا ماضی جیسے اس ہال میں بلکہ رکاسی کے چپے چپے میں آج تک کوئی چیز تلاش کرتا پھرتا ہے: لیکن آج کی رکاسی تو اس طرح سج دھج کر، اس قدر رعنائیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر آفتاب احمد کے سامنے کھڑی ہے کہ اس کی آنکھیں چوندھیا گئی ہیں، وہ پلکیں جھپک جھپک کر ان نئے اجالوں سے آنکھوں کو مانوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ جان چکے ہیں کہ آفتاب احمد آج سے تیس سال قبل پہلی بار رکاسی سے متعارف ہوا تھا جب کہ اس کے ایک دوست سے کامیابی کی خوشی میں اس نے 'پارٹی' دی تھی۔ جانے کیوں اس کو رکاسی کی وہ فضائیں پسند آئیں جن میں آدمی اپنی زندگی بھر کی تنہائیوں کو ساتھ لا کر بھی بہل جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ رکاسی کی باڑھ میں سسکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں میں ایک ایسی کیفیت ہے جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آنچ بھی لگاتی ہے، اس کو ہوا بھی دیتی ہے۔ اتنی بڑی عمارت کے اطراف پھیلے ہوئے اتنے وسیع احاطے میں کہیں کہیں دو چار گدے اس طرح جلتے تھے جیسے انسانی دکھ درد کو ننگا نہ کرنا چاہتے ہوں۔ وہ کھلی فضا میں چبوتروں پر بکھری ہوئی روغنی کرسیوں پر انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل اور ان دلوں کی مختلف کیفیت کو حاضر کرتے ہوئے پھر بالکل عیاں اور عریاں ہو کر ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے اگر یہ روشنیاں تیز ہوتیں۔

رکاسی کی فضاؤں پر ایسی بولتی ہوئی خاموشی، ایک ایسی آباد ویرانی کا گمان ہوتا جس کا تعلق صرف عالم محسوسات سے ہوتا ہے اور آفتاب احمد اس عالم محسوسات کا دلدادہ اور رسیا تھا جو اس کو رکاسی کے ماحول میں مل گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چپکے سے دوستوں کی محفلوں سے اٹھ کر رکاسی چلا آتا۔ کبھی کسی گوشے میں بیٹھ کر "لیمن اسکواش" پیتا۔ کبھی ٹھنڈی کافی، کبھی گرم چائے، کبھی اس کی جیب اجازت دیتی تو وہ رات کا کھانا یہیں پر کھا لیتا اور گھنٹوں بیٹھا یہاں کے پرفسوں ماحول سے سکون پاتا۔

پھر وہ قریب قریب روز آنے لگا "بیرے" اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منیجر کے لیے اب اس کا چہرہ مانوس سا ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شخصیت ہی ان سب کے لیے مانوس ہو چلی تھی۔

اپنی شاموں کی خوشیاں، اپنی شاموں کی اداسیاں، اپنی شاموں کا حاصل، اپنے ساتھ لیے وہ برابر رکاسی پہنچ جاتا۔ رکاسی سے اس کی یگانگت بڑھتے بڑھتے ایک بے نام سی ضرورت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہی ضرورت لگاؤ اور انس تک جا پہونچی اور رہوتے ہوتے آفتاب احمد کی زندگی میں رکاسی اس طرح داخل ہوئی کہ اس کی شاموں کی ساتھی بن بیٹھی۔

دن مہینوں میں تبدیل ہوئے، مہینے برسوں میں۔ "انٹر میجیٹ" کا طالب علم اب آفتاب احمد ایم۔ اے ہو چکا تھا۔ کتنی ہی نئی دوستیاں رکاسی کے پرسکون ماحول میں پروان چڑھیں کتنی ہی پرانی محفلیں اور دوستیاں رکاسی سے اس کے تعلق خاطر کے سبب آفتاب احمد کو چھوڑ چکیں۔ اس کے زمانۂ طالب علمی کے دو چار دوست اس کو رکاسی میں پھر ملے۔ دوستوں کی تجدید ہوئی لیکن اس پچھلے دھاگے کے بندھن پھر استوار نہ ہو سکے۔ کوئی نوکری پاکر ضلعے پر چلا گیا، کوئی شادی کر کے گھر کا ہو رہا۔ آفتاب احمد جانے والوں کی یادوں کو دل میں چھپا کر

آہستہ آہستہ چھوٹا رہا اور آنے والوں کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ پوری ایک نسل جو اس کی ساتھی تھی، اس کے سامنے بوڑھی ہو گئی۔ اس نے عمر کے فرق کو محسوس کیے بغیر نئی نسل کے نوجوانوں کو دوست بنا کر انھیں نوازا اور جو بھولے بھٹکے اکا دکا اس کے اپنے ہم عمر، اسکی اپنی زندگی کی راہوں پر کہیں کہیں مل جاتے تھے، ان سے دوستی نبھائی۔ وہ نہ کسی کی قبر پر دیا جلانے کا قائل تھا نہ کسی عرس میں روشنیاں گل کرنے کا۔ غم ملتے تو وہ انھیں پیار کر لیتا خوشیاں ملتیں تو وہ انھیں چوم کر چھوڑ دیتا۔ نہ وے اس کے دل میں جاگزیں ہوتے نہ یہ اس کے دل میں زہر بن جاتیں۔ جو مل گیا سو اس کا، جو چھوٹ گیا سو اس کا نہیں۔ پانے اور کھونے کے درمیان اس نے ایک ایسا سمجھوتہ کر رکھا تھا جو نہ غم کو غم بننے دیتا، نہ خوشی کو خوشی وہ تو زندگی کی کڑی دھوپ میں ننگے سر چل پڑا تھا۔ سائے دار درخت ملا تو سستا لیا، بگولے اٹھے یا چکر چلے تو کترا کر نکل جانے کی کوشش میں جھلس گیا۔ ٹھنڈی چھاؤں میں گھڑی دو گھڑی بھی دم لینا بھی گوارا، چٹیل میدان میں لو کے تھپیڑے بھی منظور۔

آفتاب احمد ایم۔ اے کی متوازن شخصیت، اس کے تحمل، اس کی بردباری اور سنجیدگی کے باعث بڑی گمبھیر ہو گئی ہے۔ بائیس چوبیس سال کے نوجوان دوست اس کو آفتاب بھائی کہہ کر اس کی دوستی پر فخر کرتے ہیں اور اس کے ہم عمر ساتھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اس کو گالی دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کو آفتاب بھائی میں بھی سکون ملتا ہے آفتاب احمد ایم۔ اے میں بھی، گالی میں بھی۔ رکاسی میں بیٹھ کر اس نے قہقہوں کا سواگت بھی مسکراہٹوں سے کیا، مسکراہٹوں کی پذیرائی بھی ہلکی ہلکی مسکان سے کی ہے۔

اس کی شخصیت کا مزاج رکاسی کی آباد ویرانی میں شاید اس لیے بار پاتا ہے کہ اس کو رکاسی کی بیرونی دنیا اپنی اندرونی دنیا کے عین مطابق محسوس ہوتی ہے۔

وہیمن دسکواش، ٹھنڈی کافی اور گرم چائے سے جب وہ بہل نہ سکا تو اس نے وہسکی کو آزمانا چاہا۔ وہسکی نے اس کو تھپک کر لوریاں بھی دیں، جھنجھوڑ کر بیدار بھی کیا۔ وہسکی نے اس کے قدم سے قدم ملا کر زندگی کی کڑی راہوں میں اس کا ساتھ دیا۔ آنکھیں بند کر کے جاگتے رہنے اور آنکھیں کھول کر سو رہنے کا گُر وہ جانتا تھا۔ رکاسی اس کی تنہائیوں میں رازداں بنیں، اس کی شاموں کی آئینہ۔ وہ رکاسی کے ایک ایک گوشے میں گھنٹوں گزار دیتا۔ تیس سال کے اس طویل عرصے میں رکاسی کا ایک ایک چپہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اپنی تنہائیاں دامنِ دل میں سمیٹ کر رکاسی کے کسی گوشے میں ان کی اک انجمن سجا لینے کے لیے آتا۔ وہسکی اس انجمن کو سنبھالنے میں مدد دیتی۔ لیکن جب اس کے دوست احباب اس کو تنہا بیٹھا ہوا پا کر اس کے ٹیبل پر پہونچ جاتے تو اس انجمن سے اٹھ کر ان میں آملتا، بالکل اس طرح جیسے انھیں کا منتظر تھا۔

آفتاب احمد ایم۔ اے نے گزنی عہدے داری کے باوجود شادی سے اس لیے گریز کیا کہ اس کو کسی بھی انداز کی پابندیاں گوارا نہ تھیں۔ اس کی رفیقۂ حیات تھی تو دن کو اس کا اپنا کتب خانہ اور شام اور شب کو رکاسی اور بہ رات گئے بستر کی شکنیں۔ دوست احباب اس کو "انسائیکلوپیڈیا" کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر کسی بھی کتاب کا حوالہ آپ کو اس سے مل سکتا تھا۔

جب عمر کا زرّیں حصہ اس نے اپنی کتابوں، وہسکی کی بوتلوں اور رکاسی کی آباد ویرانیوں کی نذر کر دیا تو پھر اس نے کسی تیسرے ہمسفر کی تلاش کو قابلِ اطمینان نہ سمجھا اور اسی لیے صرف اس نے شادی نہیں کی بلکہ بہت جلد ہی نوکری بھی چھوڑ دی۔

کتب خانہ سے نکل کر وہ "شیو" کرتا، جی بھر کر ٹھنڈے پانی سے نہاتا۔ بڑے سلیقے سے نکھرے ستھرے کپڑے پہن کر چہل قدمی کرتا ویسٹ اسٹینڈ تک پہونچ جاتا اور ساڑھے سات

تک گھومتا پھرتا، رکاسی کے احاطے میں داخل ہو جاتا۔

رکاسی، اس کے بیرے، اس کا منیجر، جیسے سب کے سب اس کے منتظر رہتے۔ مسکراہٹوں کے تبادلے اور پیام اور سلام کے بعد وہ کسی گوشۂ عافیت میں پناہ لیتا اور رکاسی اپنی ہلکی ہلکی روشنیوں کے ساتھ اس طرح نیم خوابیدہ عالم میں بیدار ہوتی جیسے اپنے احاطے میں بکھرے ہوئے انسانی چہروں پر مدھم روشنیوں کا غازہ چڑھا کر جِلا بخش رہی ہو۔

کبھی کوئی پرانا ساتھی یا جانی دوست اسے مل جاتا اور ایسے میں کسی اندرونی شدید جذبے کے تحت دونوں ہی دیر تک بیٹھے جام پر جام چڑھاتے رہتے اور اس کے باوجود بھی سیری نہ ہوتی اور رکاسی کے مدھم اجالے آہستہ آہستہ اندھیروں کی آغوش میں سو جاتے، تو وہ اس کو لے کر ان بڑی بڑی الماریوں کے پیچھے منیجر کے پاس چلا جاتا، جہاں دوسرے گاہکوں سے چھپا کر اسے مزید شراب دی جاتی۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ منیجر الماریوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر کے چلا جاتا اور وہ پی چکنے کے بعد بل کی رقم خالی گلاس کے ساتھ الماری میں رکھ کر چابیاں اس مخصوص مقام پر رکھ جاتا جو صرف اس کو اور منیجر کو ہی معلوم رہتا۔

رکاسی کی یہ خصوصیات، رکاسی کی یہ اپنائیت، رکاسی کی یہ محبتیں اس کی زندگی کا حاصل ہو گئی تھیں۔

اگر کوئی تھا جس کو آفتاب احمد ایم۔ اے نے چاہا جس کی دلداری کی، جس کے لیے اپنے معاملات میں فرق آنے کو بھی گوارا کیا، تو وہ تھی اس کی ماں۔ اور جب اس کی ماں شدید بیمار ہوئی تو آفتاب احمد جس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے پچاس سال کی عمر تک نہ کسی کی تیمارداری کی تھی نہ کسی کا دن رات اس طرح خیال کیا تھا کہ بس ایک ہی شخصیت مرکزِ توجہ ہو جائے،

بالکل ہراساں، پریشان اور خائف ہو گیا۔ آج تک اس ماں نے ہی اس کے ناز اٹھائے تھے۔ آج تک تو اس کے گھر پر اس کے قدموں کی چاپ کا کوئی منتظر تھا تو اس کی ماں تھی اس کے دروازہ کھٹکھٹانے کے خاص انداز پر کوئی بھی نیند سے چونک کر بیدار ہوتا تو وہ اس کی ماں ہوتی۔ اور اس کی ماں کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا، کوئی حریف نہ تھا جو آفتاب احمد اپنی محبت اپنی بیوی، اپنے بچوں اور اپنی ماں میں تقسیم کرتا۔ اس نے آفتاب احمد کو ٹوٹ کر چاہا تو آفتاب احمد نے بھی بلا شرکتِ غیرے اپنی محبتیں اس کو تج دیں۔

عمر سب سے بڑی بیماری تھی۔ آفتاب احمد جان گیا تھا کہ اب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی جو رات گیے اس کی آہٹ کی منتظر رہتی ہیں۔ اس نے تندہی سے ماں کی تیمارداری اور خدمت کی۔ تقریباً دو ماہ تک وہ بالکل گھر سے باہر نہ نکلا۔ ہر شام اپنے معمول کے مطابق وہ گھر ہی پر پی لیا کرتا۔ ہفتے بھر تک جب وہ باہر نظر نہ آیا تو کچھ دوست خیر خیریت پوچھنے گھر چلے آئے کسی نے بتایا کہ رکاسی بند ہو چکا ہے اور کورٹ میں ایک زمانے سے عمارت کے مالک اور رکاسی 'بار' کے منتظمین کے درمیان جو قضیہ تھا وہ مالکِ عمارت کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے۔

یہ خبر آفتاب احمد کے لیے کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ تیس سال کے کسی ایسے ساتھی کی موت جو زندگی کا بوجھ اٹھانے میں برابر کا حصہ ادا کر رہا ہو اور خوشیوں اور مسرتوں کے حصول میں بھی، کوئی معمولی سا غم نہ تھا۔ ہاتھ تھامنے کے لیے جیسے اس نے پکارا رکاسی رکاسی، لیکن رکاسی اس کی راہ تک تک کر مر گئی تھی۔ اس نے دبی زبان سے کہا، "اب کیا ہوگا یار؟" اس کے دوست نے آفتاب احمد کی بہت دور سے آتی ہوئی آواز سن لی۔

اس نے انکشاف کیا کہ رکاسی پھر سے کھلنے والی ہے۔ دوسرے لوگ جو اس عمارت کو کرائے پر لے رہے ہیں وہ رکاسی کے نام کی 'رائیلٹی' ادا کر کے پھر بار اور رسٹوراں ہی

کھو دینے والے ہیں اور عام خیال یہ بھی ہے کہ رکاسی اس بار بڑی سج دھج سے کھلے گی۔

دوست چلے گئے تو آفتاب احمد نے گھڑی دیکھ کر اپنی ماں کو دوا دی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ـــــ اسے بہلانا چاہا۔ لیکن جب ماں نے کراہتے ہوئے اس سے پوچھا، "کیوں آفتاب آج تو تو کچھ اداس اداس ہے بیٹا" میری دلجوئی کرنے ہنستا ہے تو ہنسی تیرے ہونٹوں پر کھلتی نہیں ہے۔ میں اچھی ہو جاؤں گی، پگلے!" تو آفتاب احمد اٹھتے ہوئے آنسو چھپا کر جب اپنی ماں کے بستر کے پاس سے اٹھ آیا تو وہ اس کو یہ بھی نہ بتا سکا، "ماں، رکاسی مر چکی ہے اور میں اسے آخری بار دیکھ بھی نہ سکا۔"

آفتاب احمد نے آج وقت سے پہلے ہی بوتل کھول کر جب وسکی گلاس میں انڈیلی تو ایک آنسو بھی اس میں جا ملا۔

ماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس سے جو کچھ بن پڑا کیا۔ اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دو ماہ کی طویل علالت کے بعد اس کی ماں کے پاس سوائے سانس کے کچھ اور باقی نہ تھا اسی اثناء میں آفتاب احمد نے سنا کہ رکاسی پھر کھل گئی ہے۔ اس بار تو اس کی سج دھج نرالی ہے۔ اس کا روپ رنگ انوکھا ہے اس کی جمال آرائی اور حشر سامانی دید نی ہے۔

اس خبر نے بھی کچھ عجیب سی کیفیت آفتاب احمد پر طاری کر دی اس نے رکاسی کی زندگی کی خبر سنی تو اس وقت سنی جب کہ اس کی ماں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ غم اور خوشی کی اس ملی جلی سرحد پر وہ چھپے ہوئے آنسوؤں کا ساتھ دے یا چھپی ہوئی مسکراہٹ کا۔

بالآخر اس کی ماں مر گئی آفتاب احمد نے بڑے تحمل سے اس کو دفنایا ختم قرآن کے لیے حافظ مقرر کیے اور گھر لوٹ کر ماں کے خالی بستر پر اس کے تکیوں میں منھ چھپا کر لیٹا رہا۔ پھر بہت ہی دل دہی سے اس کی قبر اپنی نگرانی میں پختہ بنوائی۔

آج ماں گھر میں نہ تھی تو جیسے اداسیاں سارے میں پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ وہی کتب خانہ، وہی کتابیں، وہی در و دیوار، وہی اس کا کمرہ، وہی چھت، وہی آنگن۔ سب چیزیں جیوں کی تیوں تھیں، صرف ماں کا بستر خالی تھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر شے میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ اداسیاں گھر میں کچھ اس طرح آئی تھیں کہ صحن کی نرم دھوپ پر بھی پرملال نزدہ مریض کی چادر کا گمان ہوتا تھا۔ ایک عمر کی رفیق اپنی تنہائیوں کو اس غمزدہ فضا میں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے وہ کئی بار رہ رہ کر یاد کرتا۔ وہسکی سے بھرے ہوئے جام میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر اسے اپنی ہستی بڑی کھوکھلی سی معلوم ہوئی۔

اپنے وجود کے بارے میں اس کے اپنے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگتے۔ زندگی کیا ہے، کیوں ہے اور اس طویل سفر میں میری اپنی کوئی منزل بھی ہے یا سفر ہی سب کچھ ہے۔ اس نے اس سوال کا جواب رکاسی سے پوچھنا چاہا۔ رکاسی جو اس کی تیس سالہ تنہائی پسند زندگی کی رازداں ہے۔ مہینوں بعد رکاسی کی فضاؤں میں سانس لینے کے قصد رہی ہے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اسے تسلی دے رہا ہو، کوئی اس کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا ہو۔

وہ شام ہوتے ہوتے رکاسی پہونچ گیا، خشک حوض جو اس کی زندگی کی طرح اب اتنا بدل گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ لوہے کے خاردار تار ٹوٹ کر نرم اور ٹھنڈی ہریالی بن گئے تھے۔ بالائی حصے پر پہونچ کر وہ ایک ایک گوشے میں اس رکاسی کو ڈھونڈھا پھرا جو اس کی اندرونی کیفیت کا بیرونی عکس رہی تھی۔ لوگ اس کو سرو کے لمبے لمبے سایوں میں ہریالی پر بکھری ہوئی کرسیوں پر خوش گپیاں کرتے نظر آئے۔ دوسری جانب کا وسیع بالائی حصہ جو خودرو گھاس کے بکھرے ہوئے ہرے ہرے دھبوں

کے باعث ایک ایسا قدرتی منظر پیش کرتا تھا جس کو انسانی ہاتھوں نے چھوا نہیں ہو۔ اب
"وہائٹ کارنر" اور "ریڈ کارنر" میں بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ ماحول تھا جہاں اپنی
تنہائیوں کی محفل سجانے کا امکان نکل آتا۔ اب نہ یادیں وہ سسکتی ہوئی ہوائیں
تھیں جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آنچ بھی لگاتی تھیں۔ اب بجلی کے گولے اس
طرح نہ جلتے تھے کہ انسانی دکھ درد کو اپنی کم روشنی چھپا لینا چاہتے ہوں۔ اب
رکاسی کی فضاؤں میں نہ وہ بولتی ہوئی سی خاموشی تھی نہ وہ آباد ویرانی تھی جس سے
آفتاب احمد صدیقی مانوس تھا۔ وہ قالین پر بکھرے ہوئے پتے رنگین پھولوں کو
روندکر جب ہال کے بیچ بیچ پہونچ گیا تو بالکل مبہوت سا اس طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا
جیسے اپنی اس شریکِ حیات کو جو برقعے میں بھی لجاتی اور شرماتی تھی، "ڈانس ہال"
میں نیم برہنہ کسی کے ساتھ رقص کرتی ہوئی دیکھ رہا ہو۔ اس نے پلکیں جھپکائیں، عینک
اتار کر آنکھیں ملیں، پھر شیشے صاف کرکے عینک چڑھائی۔ لیکن نہ رکاسی نے اسے پہچانا نہ
اس نے رکاسی کو۔ وہاں تو ایک چہرہ بھی نہ تھا۔ وہ چپ چاپ ہال کے باہر نکل گیا۔

اس نے اچٹتی ہوئی نگاہیں، سرو کے لمبے سایوں کے نیچے بچھی ہوئی ہریالی پر ڈالیں،
پھر اسی سمت بڑھ کر ایک ایسے کنج میں بیٹھ رہا جہاں کم سے کم نظریں اسے دیکھ پائیں۔
دیر تک بیٹھا وہ وہسکی پیتا رہا۔ اس کی آنکھیں رکاسی کو تلاش کرتی رہیں، اس کا جی
چاہا وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر پکارے "رکاسی تم "ڈانس ہال" سے باہر نکل آؤ اور مجھے سینے سے
لگا لو۔ میں تمھاری صورت کے لیے ترس گیا ہوں۔ میں وہ سب کچھ زندگی کے دست برد
سے بچا کر آج بھی تمھارے لیے یہاں لے آیا ہوں، رکاسی، جو ہم دونوں کو مشترک تھا، لیکن تم
بدل گئی ہو، تم جو میری تنہائیوں کی آغوش تھیں، تم جو میرے دکھ درد کا رشتہ تھیں۔

دیوانوں کی طرح چپے چپے کو تکتا ہوا گوشے گوشے میں کچھ ڈھونڈھتا ہوا وہ جب سیڑھیاں اترنے لگا تو اپنا بھیگا ہوا رومال جیب میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا ـــــ ماں مر گئی تھی زندگی سے کوئی شے کم ہو گئی تھی، لیکن رکاسی تو زندہ ہے.... پھر وہ بھیا تک کیوں نہیں جاتی پھاٹک تک آکر اس نے ایک نگاہ پھر رکاسی پر ڈالی۔ رکاسی سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے بہ آواز بلند پوچھا، میں اب اپنی شامیں لے کر کہاں جاؤں؟ رکاسی، تم ہی بتاؤ؟ لیکن کچھ جواب نہ پاکر اپنی بقیہ زندگی کی طویل شام سینے سے لگائے وہ باہر نکل گیا۔

■■